سلسلہ مطبوعات ادارۂ دار الاسلام (۱)

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کا مقصد وحید اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصولِ تہذیب و تمدن پھیل رہے ہیں ان پر قرآنی نقطہ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سنت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانۂ جدید کے حالات پر ان اصولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔

یہ رسالہ امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"اپنے دل اور دماغ کو مسلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراط مستقیم پر چلو۔ قرآن کو لے کر اٹھو اور دنیا میں غالب بن کر رہو"

یہ رسالہ سات سال سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور ملک کے مشہور رسالوں کی صف اول میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ نمونے کا پرچہ ۸ر

منیجر رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور

صرف سرورق [illegible] پریس [illegible] روڈ لاہور میں طبع ہوا

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل
کے امکانات پر ایک تبصرہ

ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بار اول فروری ۱۹۳۹ء آٹھ ہزار

بار دوم فروری ۱۹۳۹ء دو ہزار

بار سوم جون ۱۹۴۰ء دو ہزار

فہرست مضامین

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہوکر دفتر رسالہ ترجمان القرآن مبارک پارک ۔ پونچھ روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

آنکھیں بند کر کے چلنا ایک شخص کیلئے جتنا مہلک ہو سکتا ہے، اس سے بہت زیادہ مہلک ایک قوم کیلئے ہوتا ہے۔ آپ کھلے میدان میں بھی بند آنکھوں کے ساتھ چل کر ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتے لیکن سڑک پر جہاں آمد و رفت کا ہجوم ہو اور رہ نوردوں کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو، اگر آپ آنکھیں بند کر کے چلیں گے تو یقیناً آپکو کسی مہلک حادثہ سے دوچار ہونا پڑیگا۔ ایسی ہی حالت ایک قوم کی بھی سمجھ لیجئے معمولی حالات میں جبکہ فضا میں کوئی غیر معمولی ہنگامہ نہ ہو، اس کے لئے آنکھیں ——— جسمانی نہیں عقل و بصیرت کی آنکھیں ——— بند کر کے چلنا محض نقصان اور مضرت کا موجب ہوتا ہے، مگر جب کوئی انقلاب درپیش ہو، جب قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا ہو، جب زندگی و موت کا مسئلہ سامنے ہو ایسے وقت میں اگر وہ آنکھیں بند کر کے چلے گی تو اُسے تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑیگا۔

یہی خیالات تھے جن کے تحت میں نے محرم ۱۳۵۶ھ سے "ترجمان القرآن" میں ان مضامین کا سلسلہ شروع کیا جنکا صرف ایک حصہ اس مجموعہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشارِ فکر و عمل میں مبتلا رہے اسکو دیکھ دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا، مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی سے روکتا رہا کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ اور قوت و اثر رکھنے والے موجود ہیں، وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے، اور ان کو رفع کرنیکے لئے متحد ہو کر وہ تدبیریں اختیار کریں گے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے انکو اختیار کرنی چاہئیں لیکن دن پر دن گذرتے چلے گئے اور یہ

امید بر نہ آئی، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمان کیلئے قسمت کے فیصلہ کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائیگی، اور اسکے ساتھ چشم دل ہی نے نہیں، چشم سر نے بھی یہ دیکھا کہ جنکی تدبیر و تدبر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے وہ اب بھی حالات کو اُس فراست کیساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے "فراستِ مومن" کہا گیا ہے، اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو اُن مختلف راستوں کی طرف چلائے جا رہے ہیں جن میں سے کوئی بھی منزلِ نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو، انکے عوام اور خواص، علماء اور زعماء، سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے جو "مسلم قوم" ہونیکی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں، اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لئے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اسکے رسول کی سیرتِ پاک ہی ہے جسے چھوڑ کر محض اپنی فکر و تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

اس مجموعہ میں صرف وہ مضامین درج کیے جا رہے ہیں جو "ترجمان القرآن" میں محرم سے رجب ۵۶ھ تک شائع ہوئے ہیں۔ میں نے ان میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت پر محض ایک مورخ یا ایک سیاسی آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، اسلیے بہت ممکن ہے کہ ایک خالص تاریخی، یا سیاسی، یا معاشی نظر رکھنے والے آدمی کو میرے بیان سے اختلاف ہو، لیکن میں یہ گمان نہیں کرتا کہ جو شخص میری طرح ایک مسلمان کی نظر سے حالات کو دیکھے گا اسے میرے بیان سے اختلاف ہوگا۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے موجودہ حالات اور انکی کارفرما قوتوں کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں بھی میرے پیش نظر اسلامی معیارِ تحقیق ہے اور ان حالات میں مسلمانوں کے اصل قومی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی جو کوشش میں نے کی ہے وہ بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی ہے۔ درحقیقت اس تمام بحث میں میرے

مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو اول بھی مسلمان ہیں اور آخر بھی مسلمان ہیں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو صرف "ہندوستانی" ہیں، یا پہلے "ہندوستانی" اور پھر سب کچھ ہیں، تو ان سے مجھے کوئی سروکار ہی نہیں۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں، اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ ان کی منزل مقصود دوسری ہے اور میری منزل مقصود دوسری۔ ان کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔ اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں، اپنی زندگی کے مسائل کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے حل کروں اور ہندوستان میں مسلم قوم کو پھر سے ایک خود مختار قوم دیکھوں۔ ان کیلئے ہندوستان کا سیاسی و معاشی استقلال بجائے خود ایک مقصد ہے اور میرے لیے وہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے جو اگر حصولِ مقصد میں مددگار نہ ہو تو مجھے بجائے خود اس ذریعہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پس میرے اور ان کے درمیان مقصدی اختلاف ہے اس لئے ان سے بحث کرنا تو میرے نزدیک محض تضیع وقت ہے۔ البتہ جو لوگ اس مقصد میں مجھ سے متفق ہیں ان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان مضامین کو غور سے ملاحظہ فرمائیں، جو کچھ حق پائیں اسے قبول کریں، اور جس چیز میں غلطی پائیں اس کا غلط ہونا دلیل و حجت سے ثابت کر دیں تاکہ میں بھی اپنے خیالات کی اصلاح کر سکوں۔

میں جانتا ہوں کہ جو لوگ مقصد میں مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سے حضرات میرے ان خیالات سے متفق نہیں ہیں جن کا اظہار میں نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ مگر اس قسم کے جن حضرات نے اخبارات میں اور پرائیویٹ خطوط میں میرے مضامین پر تنقیدیں کی ہیں ان کی تنقیدوں کو دیکھ کر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا کہ آخر انہیں اختلاف کس چیز سے ہے؛ عموماً ان کی تحریروں کو دیکھ کر تو میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ وہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ ایک شخص ان کے طریق کار سے اختلاف کر رہا ہے، پوری طرح اس کے خیالات کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، اور تنقید لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر حضرات

نے میرے اوپر وہ اعتراضات کئے ہیں جنکا جواب میں خود ہی اپنے مضامین میں دے چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر انہوں نے ان مضامین کو پڑھا بھی ہے تو دل کے دروازوں کو بند کر کے پڑھا ہے۔ میں عرض کرونگا کہ یہ طریقہ اہل حق کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہم کوئی مجلس مناظرہ تو قائم نہیں کر رہے ہیں جس کا مقصد محض دماغی زور آزمائی ہوتا ہے اور جس میں ہر فریق پہلے سے یہ فیصلہ کر کے شریک ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات نہ مانیگا اور اپنی بات پر اڑا رہیگا۔ ہمارا مقصد تو اس ملت کی حفاظت اور سربلندی ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو یکساں عزیز ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر جو شخص کچھ کہہ رہا ہے اسکی بات کو کھلے دل کے ساتھ سُنیے، پوری طرح سنیے، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیجیے، اور یہ فرض نہ کر لیجیے کہ جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے، اس لیے اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے وہ بہرحال باطل ہی ہونا چاہیے۔ وہ غریب آپ سے لڑنے کیلیے نہیں اٹھا ہے بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کیلیے اٹھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ قدم اٹھانے سے پہلے اپنی منزلِ مقصود متعین کریں، اور اس منزل کی طرف جانے کیلیے وہ راستہ معلوم کریں جو یقیناً صحیح ہو، جسکی صحت اتنی ہی یقینی ہو جتنی ہدایت ربانی کی صحت یقینی ہے۔ پس آپ جویائے حق بنکر اسکے معروضات کا مطالعہ کریں اور دوران مطالعہ میں صواب کو خطا سے میز کرتے چلے جائیں۔ جو کچھ صواب نظر آئے اُسے قبول کر لیں اور جس چیز میں خطا پائیں اسکے متعلق واضح طور پر بتا دیں کہ اسے کس بنا پر آپ خطا سمجھتے ہیں۔ آیا وہ کتاب اللہ کے خلاف ہے؟ سنت رسول اللہ کے خلاف ہے؟ عقل کے خلاف ہے؟ یا کسی اور ایسی چیز کے خلاف ہے جو تمہ حق و باطل کی معیار ہو؟ اس توضیح سے راقم کو بھی اپنے خیالات پر نظر ثانی کرنیکا موقع ملیگا اور نیک نیتی کیساتھ مباحثہ کر کے ہم سب ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ یا اگر اختلاف باقی بھی رہا تو کم از کم غلط فہمیاں باقی نہ رہیں گی۔

اس مقدمہ کو ختم کرنیسے پہلے ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ "ترجمان القرآن" میں اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھونگا اس میں میرا مقصد مسلمانوں کے کسی گروہ کی حمایت کرنا اور کسی

دوسرے گروہ کو جمہور مسلمین کے سامنے خطا کار ٹھیرانا نہیں ہے اسلئے تمام ناظرین سے میری استدعا ہے کہ وہ ان مضامین کو پڑھتے وقت اپنے ذہن کو پارٹی فیلنگ اور بدگمانی سے محفوظ رکھیں۔ میں گروہ بندی سے ہمیشہ دامن کش رہا ہوں اور مجھے فطرۃً اس چیز سے نفرت ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہ اپنے اجزائی تعصبات سے دل کو پاک کر کے خالص اسلامی نظر سے اپنی قوم کے اور ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھیں اور اسلامی ذہنیت ہی کیساتھ اپنے لیے راہِ نجات تلاش کریں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ جب ایک نظر اور ایک ہی ذہنیت کیساتھ مشاہدہ اور تفکر کیا جائیگا، اور نفسانیت کا شیطانی عنصر بیچ میں نہ رہیگا تو یہ نزاعات جو عین خانہ بربادی کے موقع پر گھر والوں کے درمیان برپا ہیں۔ خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

جو حضرات "ترجمان القرآن" میں ان مضامین کا مطالعہ فرما چکے ہیں ان سے میں عرض کروں گا کہ اس مجموعہ کو پھر ایک مرتبہ اول سے آخر تک ملاحظہ فرمائیں، اسلیے کہ نظرِ ثانی کے بعد اب اس میں بہت سے مباحث کا اضافہ کر دیا گیا ہے جنکی طرف تسوید اول کے موقع پر ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔ نیز قریب قریب ان تمام اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے جو ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے اخبارات میں اور نجی خطوط میں کئے ہیں۔

ابوالاعلیٰ

۲۹ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

آنے والا انقلاب اور مسلمان

ہندوستان میں تیزی کیساتھ ایک نیا انقلاب آرہا ہے جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا پھر اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہو رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب ہندوستان پر اثر انداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رخ اچانک پھیر دے اور اسکو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پُر خطر بنا کر رہے۔

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رو پر بہنے کیلئے تیار ہیں اور جنکو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لیئے زندگی کا کوئی راستہ معین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے۔ انہیں غفلت میں پڑا رہنے دیجئے، زمانہ کا سیلاب جس رخ پر بھی بہے گا وہ آپ سے آپ اسی رخ پر بہہ جائیں گے۔ اسی طرح ان لوگوں سے بھی قطع نظر کیجئے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر ایمان لائے ہیں اور بالارادہ اسی رخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جا رہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے، اور ہماری آیندہ نسلیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ راست پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کیلئے یہ وقت روا روی سے گذار دینے کا نہیں بلکہ گہری سوچ اور نہایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملیگی بلکہ اسی دنیا کی زندگی میں ان پر چھا جائیگی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ انکی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائیگا، اور وہ بے بسی کیساتھ اسکو دیکھا کرینگے۔ زمانہ انکے قومی وجود کو ملیامیٹ کریگا، ایک ایک کرکے ان امتیازی حدود کو ڈھائیگا جن سے اسلام غیر اسلام سے متمیز ہوتا ہے اور اس

خصوصیت کو فنا کر دیگا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے، وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ انکی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ انکی اپنی اولاد اس فوج کی سپاہی بنکر اُٹھے گی جسے اسلام اور اسکی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائیگا۔ وہ اپنے ان جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائینگے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے۔

یہ انجام یقینی ہے اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا۔ انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے، اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کیلئے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور ہے۔ صدر اول میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لیکر آئیں اسلئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دار الاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آ جاتے تھے۔ چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اسکے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو وہ خود عجمی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روح جہاد اور علماء میں روح اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ ہمارے حکمران زیادہ تر وہ لوگ تھے جنکو خراج اور توسیع مملکت کی فکر تھی۔ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جنکی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی، نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیئے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اسکے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہئے ویسی ہوسکی۔ علماء اور صوفیاء کے ایک مختصر گروہ

نے بلاشبہ نہایت زرین خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندستان کے مسلمانوں میں کچھ علم دین اور کچھ اتباع شریعت پایا جاتا ہے لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جبکہ قوم کے عوام جاہل، اور انکے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں۔

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہو کر ہندستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے مگر اسلامی اصول پر انکی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سواد اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد میں گرفتار رہا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے۔

جو مسلمان باہر سے آئے تھے انکی حالت بھی ہندستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دنیا انکی مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا۔ وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مل گئے، کچھ انکو متاثر کیا اور کچھ ان سے متاثر ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجون مرکب بنکر رہ گیا۔

عام طور پر جو طرز تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کیلیے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ قرآن اور حدیث کے علوم جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے یہاں کے نظام تعلیمی میں بہت ہی کم بار پاسکے۔

طرز حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جسکی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی، بلکہ اپنی قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اسکے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا خصوصیت کیساتھ مغل فرمانرواؤں نے اس باب میں جس جاہلانہ لاپرواہی اور تساہل انگاری سے کام لیا ہے اسکی مثال تو شاید دنیا کی کسی حکمراں قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دستکش ہو جائیں اسکو

زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

انحطاط کا آغاز اور اسکے ابتدائی آثار گیارہویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا مگر عالمگیر کی طاقتور شخصیت اسکو روکے ہوئے تھی۔ بارہویں صدی کی ابتدا میں جب قصر اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہو گئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظام اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعتہً درہم برہم ہو گیا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور انکے ذہنوں سے نکل گیا۔ انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہو گئی۔ ان میں ہزاروں ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جنکا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا، اور جو اپنے ذاتی فائدہ کیلئے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگانِ شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمن اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دیکر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بدتر سے بدتر خدمت لے سکتا تھا انکے سوادِ اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اسکا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔ غیروں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں انکو عزت محسوس ہونے لگی دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ اور جب کبھی کوئی غیرت مند شخص اقتدارِ قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کیلئے اٹھا، اسکا سر خود اسکی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اسطرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا سیاسی اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور سیاسی اقتدار کے مٹتے ہی یہ قوم افلاس، غلامی، جہالت اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔

انگریزی حکومت کے دوران میں مسلمانانِ ہند کی حالت ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا وہ سب علیٰ حالہٖ قائم تھیں اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ انکے اندر اسلامی تہذیب کی بنیاد پہلے سے کمزور تھی اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب

انکو ہٹا دیا، اور افلاس و غلامی کی دوہری مصیبت میں وہ گرفتار ہوئے تو دوسری اور کمزوریاں روبکار آگئیں۔

دین اور اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور انکی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حیوانیت سے بالاتر ہوں۔ پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسائش بدن اور لذات نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جب انسان مقام حیوانی سے قریب تر ہوتا ہے تو اسکی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ انکی خاطر بلند تر انسانیت کی ہر متاع گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے بلکہ حیوانی زندگی کی آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لئے کوئی چیز ان چیزوں سے اعلیٰ اور ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا اس زمانہ میں اسکی انسانیت پر حیوانیت غالب آچکی تھی، مگر انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی، اس لئے وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گرانقدر متاعوں کو قربان کر رہا تھا، مگر اسکو یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گرانقدر ہیں اور کسی نہ کسی طرح انکی بھی حفاظت کرنی چاہیئے لیکن جب سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گذرنے پائی اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، بندۂ شکم اور آسائش بدن کی غلام بنکر اٹھ رہی ہے۔ نئی تربیت پائے ہوئے مغربی تعلیم کی بدولت یہ کہنے لگے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دینی اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے، اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اسوقت تک یہ چیزیں انکی نگاہ میں کافی اہمیت رکھتی تھیں لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنہوں نے انکو حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں انکے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دینی اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و عزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی، دوسری طرف خود غرضی و نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے انکو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو انکو کچھ مال اور جاہ اور

اپنے ہجنسوں میں کچھ سربلندی عطا کرسکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلہ میں وہ انسانیت جس گوہر بیش بہا کو چاہے خرید لے تیسری طرف انفرادیت اور خودپرستی جو ڈھائی سو برس سے انکی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے، انتہائی حد کو پہنچ گئی یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی، اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں جنکی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کیلئے مجتمع ہوسکتے اور مشترک جدوجہد کرسکتے ہیں۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کیساتھ بیان کیا جاسکے، تاہم مختصراً اسکے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کرینگے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آجائے اور یہ اندازہ کیا جاسکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آرہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثرانداز ہوگا۔

انگریزی حکومت کی پالیسی جس روز سے برٹش امپیریلزم نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اسی روز سے اسکی مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض کیلئے مسلمان ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظام عدل وقانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا اسی غرض کیلئے انتظام مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جنکا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ وبرباد کردیا جائے اور ان پر رزق کے دروازے بند کردیئے جائیں۔ چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی، وہ اب روٹیوں کو محتاج ہوچکی ہے۔ اسکو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کرکے محروم کردیا گیا ہے، اور اب اسکی ۹۰ فیصدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برٹش امپیریلزم کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام عدالت اس کیلئے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سودخوار پٹھان کیلئے اسکا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

مغربی تعلیم کا اثر سیاسی اقتدار سے محروم ہونیکے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونیکے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب

نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کیلئے نہیں ہے یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نا مسلمان بنکر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصول حیات اور طرز معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیئے جائینگے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ بیچارے اس پرانے کباڑ خانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بیش بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جارہی ہیں، آخر ہیں کس کام کی؟ انہیں تو رہن رکھ کر بنئیے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے!

مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا۔ مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ۹۰ فیصدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اسلامی تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز انکی نظروں سے نہیں گذرتی وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے اور یہ معبود اس مغربی تہذیب کی طرف انہیں لیے جارہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنیکا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں، حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ انکا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انہیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جسکا حکم مذہب نے انکو دیا ہے، اور ہر اس کام سے رغبت ہے جسکی طرف مغربی تہذیب انہیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا انکے ہاں معیوب ہے اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اسے انکی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کونسی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لیے جارہی ہے۔ بخلاف اسکے سینما جانا ان کے نزدیک

نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازم حیات میں سے ہے اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال مُلا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکت عظمیٰ سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ جو طبقے ہماری سوسائٹی کے پیش رو اور مقتدا ہیں وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں۔ انکو بھی اسلام اور اسکی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اسکے طور طریقوں اور اسکے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تاثر کا مادہ فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے جو راستہ مردوں نے ستر برس میں طے کیا ہے عورتیں اسکو بہت جلدی طے کر لیں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پا کر اٹھیں گی ان میں شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔

قومی انتشار خود غرضی، انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے اور انکی اجتماعی طاقت فنا ہو چکی ہے۔ پندرہ سال سے انکے اندر سخت انتشار برپا ہے انکی کوئی قومی پالیسی نہیں، کوئی اجتماعی ہیئت نہیں، کوئی ایک شخص نہیں جو انکا لیڈر ہو، کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمائندہ ہو، کسی بڑی سے بڑی قومی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک بن سری فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور اپنا پیرو ہے۔ انجمنیں اور جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسرپیکار ہو جاتے ہیں اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلے پر آ جاتے ہیں۔ اوّل اوّل انکو اپنی اُس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی مگر ہمسایہ قوموں نے دس سال کے اندر انکو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے۔ یہ آپس میں لڑتے رہے اور وہ منظم ہو

گئیں ۔۔۔۔۔۔ انہوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، اور انہوں ایک سر اس کی اطاعت کر کے اُسے تمام ملک میں بے تاج و تخت کا بادشاہ بنا دیا ۔۔۔۔۔ یہ اپنی قوتوں کو خود اپنی تخریب میں ضائع کرتے رہے اور وہ حکومت سے پیہم مقابلہ کر کے اپنا زور بڑھاتے رہے ۔۔۔۔۔ انہوں نے ملک کے تازہ انتخابات میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا اور بیسیوں پارٹیاں بنکر اسمبلیوں میں پہنچے ۔ انہوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھ کر تمام ملک میں منضبط جدوجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ کر لیا ۔ ان نتائج کو دیکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں پر اب بھی اثر ہو رہا ہے جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے ۔ ایک منظم جماعت کی کامیابیوں سے وہ مرعوب ہو گئے ہیں ۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلدی انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اس نئی جماعت کے ہاتھ میں آنیوالا ہے ۔ لہٰذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں ۔ انکے سجدوں کا رُخ وائسریگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا ۔

آنیوالے انقلاب کی نوعیت یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن ۔ اب دیکھیے کہ جو انقلاب آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے ۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے ۔ جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اسکے اثرات تو وہ تھے جو آپ نے دیکھ لیئے ۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آرہی ہے وہ ملک کی آبادی کا سواد اعظم ہے ۔ گذشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں انکو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجیے کہ اس قوم کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہوتے کتنی دیر لگے گی ۔

جدید ہندی قومیت کا علمبردار وہ شخص ہے جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے ۔۔۔۔۔ پھر اس قومیت کا

دشمن ہے جسکی بنا کسی مذہب پر ہو اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا۔ یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں، بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست، اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے؟

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب انکے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گذری ہیں ان سے یہ راز کب چھپا رہ سکتا تھا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے، وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں اور اب اسکے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کیلئے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں یہی چیز ہے جسکی بنا پر اب یہ اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے انکے افراد کو خطاب کیا جائے اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے وہ اسکو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیریکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اسکو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ کیا اسمبلیوں کی نشستوں اور آئندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ انکے افراد کو فوج در فوج اس طرف کھینچ کر نہ لے جائیگا جس طرف انہیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کر ینگے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپنے سُنا کہ انہیں کھینچنے کیلئے جو صدا بلند کی جا رہی

ہے وہ کون سی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور داڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا؟ اس میں آخر کون سی اہمیت ہے؟ اصلی سوال تو پیٹ کا سوال ہے۔ اسی سوال کو حل کرنے کیلئے ہم اٹھے ہیں۔ اب اگر دہریت اور کیمونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا اہر نوالے کیساتھ پیٹ میں اتر جائے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کیساتھ الحاد اور فرنگیت کا زہر بھی اتار چکی ہے، اس کے حلق میں ویسے ہی چند اور چنیاں کیوں پھنسنے لگیں؟

جدید انقلابی دور کی ابتدائی علامتیں اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو آب آ رہا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں انکی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ انکی صورتیں، انکے لباس، انکی بات چیت، انکی چال ڈھال، انکے آداب اطوار، انکے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ مسٹروں کے بجائے شری مت اور مسوں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ گڈ مارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے۔ اور بعض علمائے دین فتوے دے رہے ہیں کہ تشبہ کی تعریف سے خارج ہے۔ غرض دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدل رہے ہیں اور كُونُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ کی لعنت جو ان پر نشر سال پہلے نازل ہوئی تھی اب ایک دوسری شکل اختیار کر رہی ہے۔

انقلاب کی تیز رفتاری دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے، اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں۔ پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور ٹٹوؤں پر سفر کیا کرتا تھا، اب ریل اور تار اور اخبار اور ریڈیو پر حرکت کر رہا ہے۔ آج

وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ نہ بھی پیش آیا تب بھی اس متوقع انقلاب کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی، اور کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو فضائے مبرم کیطرح دُنیا کے سر پر لٹک رہی ہے تو غالباً فیصلہ کا وقت اور بھی زیادہ قریب آجائے گا۔

حالات کا جائزہ اور آئندہ کے امکانات

پچھلے باب میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اس انقلاب سے آگاہ کیا تھا جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ——— ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کی نوعیت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا اور اسکے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی چار بنیادی کمزوریاں | پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر ایک سرسری تبصرہ کر چکے ہیں جس سے اجمالاً آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اجتماعی حیثیت سے اس وقت مسلمانوں میں کس قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن آگے جو کچھ ہم کو کہنا ہے اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ واضح طور پر ان چار اہم ترین کمزوریوں سے واقف ہو جائیں جو مسلمانوں کی قومی طاقت کو گھن کی طرح کھا گئی ہیں اور درحقیقت انہی کی وجہ سے یہ سوال پیدا بھی ہوا ہے کہ آنے والے انقلاب میں کیا مسلمان اپنی اسلامی قومیت اور اپنی اسلامی تہذیب کی حفاظت کر سکیں گے؟ ورنہ اگر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو کسی مسلمان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی اور اہم ترین کمزوری | مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سوادِ اعظم اسلامی تہذیب اور اسکی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہے، حتیٰ کہ اس میں ان حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ انکے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات قبول کر رہے ہیں اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے ——— ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا کہ

زنانہ کیرکٹر بن گیا ہے جسکی نمایاں خصوصیت تاثر اور انفعال ہے ــــــ ہر طاقتور انکے خیالات کو بدل سکتا ہے، انکے عقائد کو پھیر سکتا ہے، انکی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے انکی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، انکے اصول حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اول تو وہ اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ دوسرے انکی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ انکے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کیساتھ آتی اور گردوپیش میں پھیل جاتی ہے، تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اسکی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظام جماعت حد سے زیادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدود اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

دوسری کمزوری | انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنیاد پر جماعتیں بنتی ہیں اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور انکے قومی کارکنوں کو اتحادِ عمل اور مخلصانہ بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں، پیہم خطرات انکے سامنے آئے۔ مگر کوئی ایک چیز بھی انکو اشتراکِ عمل کیلئے جمع نہ کر سکی۔ تازہ ترین واقعہ

مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوری کا راز اپنوں سے زیادہ غیروں پر فاش کر دیا۔ لہٰذا اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں، مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جنکی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اسکی بات کو مانیں اور اسکی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لئے اپنے ذاتی مفاد اپنی ذاتی رائے، اپنی آسائش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔

تیسری کمزوری افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ انکا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام و نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح انکی طرف لپکتے ہیں، اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی خدمت بجا لاتے ہیں انکو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہاں کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا آج اتنا سستا ہو گیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہو سکتا ہے۔ ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جا سکتا ہے، ایک خطاب، یا ذرا سی شہرت عطا کر کے یا دو چار پیسے کے نذرے لگا کر اسکو خرید لیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لیے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار انکو مل گئے جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود ہے تو جس طرح پچھلے ہزار میل دور کے بسنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ بسنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بری نہ معلوم ہو تو ہم صاف

کہہ دیں کہ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکیٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے ـــــ ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبانوں سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہے جانیکی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر ہی نہیں ہے تو ہمارا حافظہ ہمکو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اسوقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکار برطانیہ کی غلامی کا ذرین پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

چوتھی کمزوری ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے اور اسکی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بکثرت اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحب قلم، صاحب زبان، صاحب مال وزر، صاحب اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اسکی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے برارت کا صریح اعلان نہیں کرتے اس لیئے مسلمان انکے ناموں سے دھوکہ کھا کر انہیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر آزادی سے زہر پھیلانیکا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کیلیے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لیئے پیام موت ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں، یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اسکی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں، مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کیطرف دعوت دیتے ہیں، ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانون اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اسکی تبلیغ کرتے ہیں۔ انکی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے کہیں سے نکلی ہو، اسکو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے، اور اسلامی

قومیت کا ایک جزو[۱] ہونے کی وجہ سے اسکو اپنا کام کرنیکا خوب موقع مل جاتا ہے۔

یہ حالت ہے اسوقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سرے پر کھڑی ہے۔ انقلاب کی فطرت، بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے۔ اسکے زور کا مقابلہ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو مضبوط جمی ہوئی چٹانیں ہی کر سکتی ہیں ——— بوسیدہ عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون و جمود کی بدولت کھڑی ہوں، انکا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحب بصیرت انسان اسوقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈالیگا، وہ بیک نظر معلوم کرلیگا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسکے لیے انقلابی دور میں اپنے قومی تشخص اور اسلامی تہذیب کے خصائص کو بچائے جانا اور اپنے آپ کو پامالی سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اول تو جہالت کی بنا پر وہ بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کرلے گی۔ پھر زمانہ کیر کر اسکو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کردے گا جنکو وہ جانتی ہوگی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک تو بلا مقابلہ ہی شکست واقع ہوگی۔ اسکے بعد جو تھوڑے بہت احساسات باقی رہ جائیں گے وہ اگر کسی شدید حملے پر بیدار بھی ہوئے، اور اس قوم نے اپنے وجود کی حفاظت کرنی بھی چاہی، تو نہ کر سکے گی، کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اسکے لئے کوئی متحدہ جدوجہد کرنا مشکل ہوگا، اور اسی کے گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن، غدار اور منافق اسکے قومی وجود کو پامال کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جدید انقلابی قوتوں پر ایک نظر | مسلمانوں کی حالت کا جائزہ آپ لے چکے۔ اب آیندہ انقلاب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان قوتوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو اس انقلابی تحریک میں کام کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت دراصل نتیجہ ہے اُس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں ہے بلکہ تمدنی اور عمرانی بھی ہے۔

[۱] یا کم از کم نیم جدید مسلمانوں کے رہنما اور اسلامی تہذیب کے حافظ بھی ایسے ہی لوگ ہیں۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری اور عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجے سے بالکل برعکس ہے
انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کا سبق دیا۔ اور ان
میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بند غلامی کو توڑ کر پھینک دیں لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و
تمدن نے انکو پوری طرح مغرب کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پالیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی
نقشہ اس نقشے کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو انکے سامنے اہل مغرب نے پیش کیا ہے۔ وہ جس قسم کی آزادی
کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ ہندستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو اپنے گھر کا
انتظام آپ کرے، اور اپنے وسائل معیشت کو خود اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے لیکن یہ آزادی حاصل
کرنے کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے وہ از سرتاپا فرنگی ہے
ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں جس قدر عمرانی اصول ہیں سب کے سب مغرب سے حاصل کئے ہوئے
ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، انکی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے
میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بلکہ انقلابیت کے بحران نے انکو یا کم از کم انکے سب سے زیادہ پر جوش طبقوں کو،
فرنگیوں میں سے بھی اس قوم کا متبع بنا دیا ہے۔ جو انتہا پسندی میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے وہ پکے
مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب
کو وہ شر و فساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پر کاہ کے برابر بھی وقعت دینے کیلیے
تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑ ہے جس کی بنیاد مذہب ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ
رواداری جو مذہب کے ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنی عبادت گاہوں اور اپنے مراسم میں جینے دیں۔
باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا انکا نصب العین ہے اور انکے نزدیک
اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیش نظر ہے اس میں مذہبی
جماعتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی

اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو، اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

کمزوریوں کے ساتھ انقلابی تحریک میں شریک ہونیکے نتائج

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے، اور وہی اسوقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لیے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اسکی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز کی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنیکے لیے مشترک جدوجہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے اور جو گروہ اس جدوجہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو اسکی طرف دلوں کا مائل ہونا اور اسکے ساتھ شریک عمل ہو جانا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علما، اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کیطرف جا رہی ہے اور عامۂ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہو جائیں۔ لیکن عمل کیطرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اسکے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپکے سامنے ہیں۔ انکو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ان کمزوریوں کیساتھ جب یہ قوم کانگریس میں شریک ہوگی اور اس کے عوام سے کانگریسی رکنوں کا رابطہ قائم ہوگا تو آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں انکے درمیان پھیلیں گی؟ کس کس طرح مسلمانوں کے عوام ان اجتماعی نظریات، ان ملحدانہ افکار اور ان غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہونگے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں؟ کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پھیلائے جائینگے جو سیاسی انقلاب کیساتھ ہم رشتہ ہے؟ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنیکی کوشش کی جائیگی جو علی رغم انف علماء و زعماء جدید ترین مغربی و اشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرنے والی ہو؟ کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کیے جائینگے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے اور ہر قسم

کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں گے؟ ان حالات میں آپکے پاس کونسی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حدود میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپنے انکو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس یہ اطمینان کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ کسی سخت وقت میں آپ اسلامی مقاصد کی خدمت مسلمانوں کو جمع کرسکیں گے اور انکی متحدہ طاقت آپکی پشت پر ہوگی؟

باطل کی جگہ باطل قائم کرنا مسلمان کا کام نہیں انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے، بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہوگا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جائیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ کو انگریز سے اس لیے عداوت ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دور سے آیا ہے، آپکے وطن کا رہنے والا نہیں ہے، تو یہ اسلامی عداوت نہیں بلکہ جاہلی عداوت ہے۔ اور اگر آپ اس سے اس لیے عداوت رکھتے ہیں کہ وہ غیر صالح ہے ناجائز طریقہ سے حکومت کرتا ہے، عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کے بجائے فساد کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اسلامی عداوت ہے۔ لیکن اس لحاظ سے آپکو دوستی اور دشمنی کا معیار اصول کو قرار دینا پڑیگا، نہ کہ وطنیت کو۔ جو کچھ انگریز کرتا ہے اگر وہی کچھ دوسرے کریں تو آپ محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کرسکتے کہ وہ ہمارے ہموطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صُہیب اور بلال کو مسلمان کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کرسکتا۔ پس اگر آپ مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے بلکہ حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا ضرور آپ کا فرض ہے۔ مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپکے لیے ہرگز جائز نہیں جسکی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپکا

کام باطل کو مٹا کر حق کو قائم کرنا ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کیخلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجئے جو اسکو مٹانا چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنیکے لئے آپنے کیا انتظام کیا ہے؟ کون سی طاقت آپنے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجئے یہی بتا دیجئے آپنے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانیکا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

کیا آئینی ضمانتیں اور تحفظات کافی ہوسکتے ہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی طریقوں کی حفاظت کیلئے آئینی ضمانتیں لینگے۔ ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے اسلامی مفاد پر آنچ نہ آنے پائے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ مگر شائد آپنے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستور اساسی کے تحفظات اور دوسرے تمام کاغذی مواثیق صرف اسی قوم کیلئے مفید ہوسکتے ہیں جس میں ایک طاقتور رائے عام موجود ہو، جو اپنے آپ کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو پہچانتی ہو، اسکی حفاظت کا ناقابل تسخیر ارادہ رکھتی ہو، اور منفرداً و مجتمعاً اسکی طرف سے مدافعت کیلئے ہر وقت سینہ سپر ہو۔ یہ صفات اگر آپکی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپکی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھئے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کارآمد نہیں ہوسکتا۔ آپ دستور اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اندرونی انقلاب کا آپکے پاس کونسا علاج ہے؟ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے اور آپکی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں۔ کونسا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اسکے زہریلے نتائج کو روکنے کیلئے استعمال کیا جائیگا؟ فرض کیجئے کہ سول میرج کے طریقہ پر نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپکی قوم خود اس تحریک سے متاثر ہوجاتی ہے۔ کونسی آئینی ضمانت اسکی روک تھام کرسکیگی؟ فرض کیجئے

کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپیگنڈا کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کردی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو بلکہ مصر ہو۔ آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصولِ اسلام کے خلاف ہوں، خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہو جاتی ہیں جو آپکے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں۔ وہ کونسے "بنیادی حقوق" ہیں جنکا واسطہ دیکر آپ ان چیزوں کو منسوخ کرا سکیں گے؟ فرض کیجئے کہ آپکی قوم بتدریج ہمسایہ قوم کے طرزِ معاشرت، آدابِ اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے اور اپنے قومی امتیازات کو خود بخود مٹانے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کر سکیگا؟ آپ اسکے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس لئے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شریک ہیں انکے نمونے آپکے سامنے موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ انکا طرزِ عمل انگریز کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ وہی ذہنی غلامی، وہی زنانہ انفعال و تأثر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو آستانہ فرنگ کے طائفین و عاکفین میں نظر آتی ہے پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے یہ کھلے ہوئے علائم و آثار آپکی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آخر کس بھروسہ پر آپ ساری قوم کو ادھر لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمائیے تو سہی کہ آپنے باطنی انقلاب و تدریجی انجذاب کو روکنے کیلئے کونسا تحفظ فراہم کر رکھا ہے؟

عوام کا جمود اور سیاسی جماعتوں کی بے راہ رویاں مسلمانوں میں اسوقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادئ وطن کیلئے بے چین ہے اور کانگریس کیطرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کیلئے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بنکر آزادی کی تحریک کو روکے تیسرا گروہ عالمِ حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کیساتھ واقعات کی رفتار کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کردی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہو جائیگی۔ ایسی ذلیل پالیسی دنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود زندہ رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، جس میں خود اپنے موقف پر کھڑے رہنے کے قابل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اسکے لئے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اسکی خاطر رُکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مدت ہوتی ہے۔ انگریز کے لئے بھی بہرحال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہوگی۔ اس کے بعد وہی قوم برسرِ اقتدار آئیگی جس میں ہمت اور طاقت ہوگی، حاکمانہ اوصاف ہونگے، عزائم اور حوصلے ہونگے، صلابت اور عصبیت ہوگی۔ اگر تم میں یہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہرحال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت اور ذلت کی موت ہی ہے۔ جو گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی ہو وہ ہمیشہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کر رہیگا۔ اور لاش کبھی نہ کبھی گر کر رہے گی۔

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقا کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معرکہ میں اُنکے لیے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لیے مقابلہ اور مزاحمت کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کیساتھ ایک دور کے خاتمہ اور دوسرے دور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلہ کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مرجانا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشہ دیکھے جاؤ۔ لیکن اگر زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سُستی رفتار کا زمانہ نہیں ہے

صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اسوقت ہندوستان اور ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آرہا ہے۔ اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اسکی خاطر اپنی سُنت کو بدل ڈالے۔

جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیئے۔ حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے۔ مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں حکمت اور تدبر کیساتھ حرکت ہونی چاہیئے خصوصاً نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور ابلہانہ شتابزدگی کا وقت نہیں۔ قدم اٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل ودماغ سے کام لے کر سوچیئے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیئے؟ آپ کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اسکی طرف جانے کا صحیح راستہ کونسا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کیلیئے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا ہوگا؟ اور ہر مرحلے سے بسلامت گذر جانے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

ہمارا سیاسی نصب العین

کسی راستہ پر چلنے سے پہلے منزل مقصود کا تعین ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت اور سفر کو بذاتِ خود تو مقصود نہیں بنایا جا سکتا۔ کم از کم ذی عقل و ہوش انسانوں کے لیے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محض چلنے کی خاطر چلیں اور منتہائے نظر کوئی نہ ہو۔ لہذا مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہیئے کہ ان کا منتہائے نظر یا نصب العین کیا ہے۔ اسکے بعد طریق کار اور راہِ عمل کا انتخاب زیادہ آسان ہو جائے گا، کیونکہ جب وہ مقام متعین ہو جس تک ہمیں جانا ہے، تو وہ راستہ بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچنے کا سب سے زیادہ سیدھا اور سب سے زیادہ اقرب راستہ ہو۔

عام طور پر آزاد خیال مسلمان اپنی "قوم پرستی" کی نمائش کرنیکے لیے کہتے ہیں کہ ہمارا نصب العین ہندوستان کی کامل آزادی ہے لیکن یہ بات عموماً بغیر سوچے سمجھے کہہ دی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزلِ مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے بلکہ عزت اور طاقت والا بنجائے۔ آزادی ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اس اصل مقصد کیلیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اس آزادی کیلیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم اس کی مدا ہنت کے صاف صاف

کہتے ہیں کہ ایسی آزادئ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے، اور اسکی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اسکے برحق ہونے میں چون و چرا نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں آزادی مسلم کا کم سے کم مرتبہ منزل مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیتہً دارالاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اسکا قصد کرنیکی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ خیر جانے دیجئے اسکو ---- اس سے فروتر درجے میں جس مقصد کے لئے ہم کو لڑنا چاہیے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دار الاسلام بنجائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجئے کہ شبہ دار الاسلام سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات ہیں ان کو بھی متناسب حصہ ملے اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انہیں بلا امتیاز مستفید ہونیکا موقع ملے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔ ہم جس چیز کو شبہ دار الاسلام سمجھتے ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونیکی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا یہ حصہ اس حد تک طاقت ور ہو کہ

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصول اسلامی کے مطابق کر سکیں یعنی ہمکو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کیلئے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، انکے اندر غیر اسلامی طریقوں

کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنیکی ضرورت سمجھیں انکو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں، مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضاء شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اسکی تمدنی و معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصول تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیر مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کریگی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑیگا۔ اگر یہ تعمیر جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیتہً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ایسی صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہو جائے گا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں، یا ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کیساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس ملک کی طاقت کسی حال میں بیرون ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

کانگریس کے "بنیادی حقوق" ہمارے نصب العین نہیں ہو سکتے یہ مقصد جسکی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جسکے لیے ہمکو لڑنا چاہیے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔ اگر آپ اپنا مقصد صرف ان حقوق کے حصول کو بناتے ہیں جنکا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لا، اور مذہبی حقوق کا تحفظ بھی (جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے ہیں) دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کر کے حکومت کی تشکیل میں طاقتور حصہ

دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ انگریزی حکومت نے بھی آپکے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں، اگر غور کیجیے، وہ کیا چیز ہے جس نے آپکو خود اپنے حقوق سے دست بردار کرا دیا؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا، پڑھنا، بولنا سب چھوڑ دو اور میری زبان اختیار کر لو؟ پھر کیا چیز ہے جس نے آپکی قوم کے ہزاروں لاکھوں افراد کو اپنی زبان سے بیگانہ بنا دیا اور انگریزی کا اتنا غلام بنایا کہ وہ اپنے گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں تک سے انگریزی بولنے لگے؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نماز روزہ چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپکی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدل دو، اپنی صورتیں بگاڑ دو، اپنے بچوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو میم صاحب بناؤ، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو، پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ سے یہ سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچیے۔ کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپکے اندرونی معاملات اور آپکے تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں بلکہ اندرونی انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے ان بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جنکو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور

نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں۔ اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی انکو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپکے اندرونی تحول و انقلاب کا کیا حال ہوگا اور کانسٹی ٹیوشن کی کون کونسی دفعات آپکو اپنے حقوق کی پامالی سے روکیں گی؟

مسلمانوں کے لیئے صرف ایک راستہ پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مسلمانوں کے لیے ایسی آزادی وطن کی خاطر لڑنا تو قطعی حرام ہے جسکا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدار حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لیئے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں، اور ان کے لیئے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کی خاطر انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیئے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادی ہند کی تحریک کا رُخ حکومت کفر کی طرف سے حکومت حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں اور اس غرض کے لئے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمر بستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

ہم آزادی ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے خواہشمند ہیں اور اس کے لیئے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن وطن پرست کے نصب العین

سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو۔ اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ "مسلم" کی نجات بھی ہو۔

راہِ عمل

اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قومیت کا وہ نصب العین جس کو ہم نے اشاعتِ گذشتہ میں بیان کیا تھا کس طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہمکو معلوم ہے اس نصب العین سے کسی "مسلم" فرد یا گروہ کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے، اس امر میں ہے کہ ہمارے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اب ہمیں ان مختلف راستوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے جو ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے بعد راہ راست خود واضح ہو جائے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہندوستان میں ہماری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ہمارے "ہندوستانی" ہونے کی ہے، اور دوسری حیثیت "مسلمان" ہونے کی۔

پہلی حیثیت میں ہم اس ملک کی تمام دوسری قوموں کے شریک حال ہیں۔ ملک افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہو گا تو ہم بھی مفلس اور فاقہ کش ہوں گے۔ ملک کو لوٹا جائیگا تو ہم بھی سب کے ساتھ لوٹے جائیں گے۔ ملک میں جور و ظلم کی حکومت ہوگی تو ہم بھی اُسی طرح پامال ہوں گے جس طرح ہمارے اہلِ وطن ہوں گے۔ ملک پر غلامی کی وجہ سے بحیثیت مجموعی جتنی مصیبتیں نازل ہوں گی، جتنی لعنتیں برسیں گی، ان سب میں ہم کو برابر کا حصہ ملے گا۔ اس لحاظ سے ملک کے جتنے سیاسی اور معاشی مسائل ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور دوسری اقوام ہند کے درمیان مشترک ہیں۔ جس طرح اُن کی فلاح و بہبود ہندوستان کی آزادی کے ساتھ وابستہ

ہے اسی طرح ہماری بھی ہے۔ سب کے ساتھ ہماری بہتری بھی اس پر منحصر ہے کہ یہ ملک ظالموں کے تسلط سے آزاد ہو، اس کے وسائل ثروت اسی کے باشندوں کی بہتری اور ترقی پر صرف ہوں، اس کے بسنے والوں کو اپنے افلاس، اپنی جہالت، اپنی اخلاقی پستی، اور اپنی تمدنی پسماندگی کا علاج کرنے میں اپنی قوتوں سے کام لینے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اور کوئی جابر قوم انکو اپنی ناجائز اغراض کے لئے آلۂ کار بنانے پر قادر نہ رہے۔

دوسری حیثیت میں ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جنکا تعلق صرف ہم ہی سے ہے۔ کوئی دوسری قوم ان میں ہماری شریک نہیں ہے۔ اجنبی استیلا نے ہمارے قومی اخلاق کو، ہماری قومی تہذیب کو، ہمارے اصول حیات کو، ہمارے نظام جماعت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر غلامی ان تمام بنیادوں کو گھن کی طرح کھا گئی ہے جن پر ہماری قومیت قائم ہے۔ تجربے نے ہمکو بتا دیا ہے اور روز روشن کی طرح اب ہم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ صورت حال زیادہ مدت تک جاری رہی تو ہندوستان کی اسلامی قومیت رفتہ رفتہ گھل گھل کر طبعی موت مر جائے گی، اور یہ برائے نام ڈھانچہ جو باقی رہ گیا ہے یہ بھی باقی نہ رہے گا۔ اس حکومت کے اثرات ہم کو اندر ہی اندر غیر مسلم بنائے جا رہے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ کی تہوں میں وہ جڑیں سوکھتی چلی جا رہی ہیں جن سے اسلامیت کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو وہ حشیش پلایا جا رہا ہے جو ہماری ماہیت کو بدل کر خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہماری مسجد کو منہدم کرا دے۔ جس رفتار کے ساتھ ہم میں یہ تغیرات ہو رہے ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے ایک مبصر اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ اس عمل کی تکمیل اب بہت قریب آ لگی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سواد اعظم خود بخود غیر مسلم بن جائیگا، اور شاذ گنتی کے چند نفوس اس عظیم الشان قوم کے مقبرے پر آنسو بہانے کیلئے باقی رہ جائیں گے۔ پس ہماری قومیت کا بقاء و تحفظ اس پر منحصر

ہے کہ ہم اس حکومت کے تسلط سے آزاد ہوں، اور اُس نظام اجتماعی کو از سرِ نو قائم کریں جس کے مٹ جانے ہی کی بدولت ہم پر یہ مصائب نازل ہوتے ہیں۔

آزادی وطن کے دو راستے

ہماری یہ دونوں حیثیتیں باہم متلازم ہیں۔ ان کو نہ عقلاً منفک کیا جا سکتا ہے نہ عملاً۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی ان دونوں حیثیتوں سے ہماری مقصود ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جتنے مسائل ہمارے اور تمام دوسرے باشندگان ہند کے درمیان مشترک ہیں انکو حل کرنے کے لیے مشترک طور پر ہی جد و جہد کرنی چاہیے، اور یہ بھی سراسر درست ہے کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ہم چاہتے ہیں وہ بھی بہر طور ہمیں اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ ہمیں ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے آزادی حاصل ہو جائے لیکن یہ تماثل اور توافق جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے، اس میں ایک بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے، اور درحقیقت اسی مقام پر بہتوں نے دھوکا کھایا ہے۔

غائر نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے بے تکان چلے جائیں۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ آکر ٹھیرے ہیں ایک دوراہہ موجود ہے۔ دو سڑکیں بالکل مختلف سمتوں پر جا رہی ہیں اور آپ کو قدم اٹھانے سے پہلے عقل و تمیز سے کام لے کر فیصلہ کرنیکی ضرورت ہے کہ جانا کدھر ہے۔

وطن پرستی کا راستہ ہم اختیار نہیں کر سکتے

آزادی وطن کا ایک راستہ وہ ہے جسکو ہم صرف ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راہ کے بنانے والے اور اس پر ہندوستان کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جنکے پیشِ نظر "وطنی قومیت" کا مغربی تصور ہے، اور اس تصور کی تہ میں انسانیت کا ہندو تصور گھرا چھپا ہوا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پر قائم ہیں مٹ جائیں اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اس

"قوم" کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے وہ اشتراکیت، اور ہندویت سے مرکب ہے، اور اس میں مسلمانوں کے اصول حیات کی رعایت، تو درکنار اسکے لئے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی انکے پاس نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جسکی گنجائش وہ اس "ہندی قومیت" میں نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق انسان اور خدا کے مابین ہے ان میں ہر گروہ کو اعتقاد اور عمل کی آزادی حاصل ہے۔ مگر جو معاملات انسان اور انسان کے درمیان ہیں انکو وہ خالص وطنیت کی بنیاد پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ منظم مذہب (Organised religion) یعنی ایسا مذہب ان کے نزدیک، اصولاً قابلِ اعتراض ہے جو اپنے متبعین کو ایک مستقل قوم بناتا ہو اور اسکو تعلیم، ہیئت، معاشرت، تمدن، اخلاق اور تہذیب میں دوسرے مذاہب کے متبعین سے الگ ایک ڈھنگ اختیار کرنے اور ایک ضابطہ کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کی رعایت ملحوظ رکھ کر کچھ مدت تک اس قسم کے "منظم" مذہب کو ایک محدود اور دھندلی سی شکل میں باقی رکھنا گوارا کرلیں گے، چنانچہ اسی گوارا کرلینے کے انداز میں انھوں نے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو انکی زبان اور پرسنل لا کے تحفظ کا یقین دلایا ہے، مگر وہ کسی ایسے نظام کو برداشت نہیں کرسکتے جو اس "منظم مذہب" کو مزید طاقت اور مستقل زندگی عطا کرنے والا ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوستانِ جدید کی تعمیر اس طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس میں یہ "منظم مذہب" رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر طبعی موت مرجائے اور ہندوستان کی ساری آبادی ایک ایسی قوم بنجائے جس میں سیاسی پارٹیوں، اور معاشی گروہوں کی تفریق تو چاہے کتنی ہی ہو، مگر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور تمام دوسری حیثیات سے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، اور وہ رنگ فطرۃً وہی ہونا چاہئے جو اس تحریک کے محرکوں کا رنگ ہے۔

یہ راستہ جسکی خصوصیات کو آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، ہم صرف اسی وقت اختیار

کر سکتے ہیں جبکہ ہم اپنی دوسری حیثیت کو قربان کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اس راستہ پر چل کر ہم کو وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جو ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے درکار ہے، بلکہ اس راستے میں سرے سے ہماری یہ حیثیت ہی گم ہو جاتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا ہے وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت اور زیادہ شدت و سرعت کیساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اسکی تکمیل میں ہم خود مددگار بنیں اور وہ اتنا مکمل انقلاب ہو کہ پھر اس کے ردِّ عمل کا کوئی امکان نہ ہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے مغربی تہذیب میں خواہ ہم کتنے ہی جذب ہو جائیں، بہرحال انگریزی قومیت میں جذب نہیں ہو سکتے۔ بہرحال ہمارا ایک الگ اجتماعی وجود باقی رہتا ہے جسکا پھر اپنی سابقہ صورت پر واپس ہونا ممکن ہے۔ لیکن یہاں تو صورت حال ہی دوسری ہے۔ ایک طرف ہمارے ہر امتیازی نشان، حتّٰی کہ ہمارے احساس قومیت تک کو فرقہ پرستی (Communalism) قرار دے کر اس کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مستقل جماعت (Community) کی حیثیت سے ہمارا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ دوسری طرف ہماری قوم کے ان لوگوں کو قوم پرست (Nationalist) کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں، "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں پہنچ کر عبادت تک میں حصّہ لے گذرتے ہیں، اپنی صورتوں اور لباسوں میں پورا ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک لیتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر فرقہ پرستی (Communalism) کا الزام نہ آ جائے جو ان کے نزدیک کفر کے الزام سے زیادہ بدتر ہے۔ تیسری طرف ہم سے صاف کہا جاتا ہے کہ ایک جماعت بنکر نہ آؤ بلکہ افراد بنکر آؤ اور سیاسی پارٹیوں میں، مزدور اور سرمایہ دار کی تفریق میں، زمیندار اور کسان کی تقسیم میں، زر والے اور بے زر کے تنازع میں

منقسم ہوجاویں بالفاظ دیگر اس رشتے کو خود ہی کاٹ دو جو مسلم اور مسلم میں ہوتا ہے، اور اس رشتہ میں بندھ جاؤ جو ایک پارٹی کے مسلم اور غیر مسلم ممبروں میں ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے اسے سمجھنے کیلئے کچھ زیادہ عقل و فکر کی ضرورت نہیں۔ اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریک آزادی وطن کے دوران ہی میں ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہوجائے، اور ہم جدا جدا قطروں کی شکل اختیار کرکے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہوجائیں۔ پھر بحیثیت مسلمان قوم کے ہم اپنی نشاۃ ثانیہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جو لوگ صرف ہندستانی ہونیکی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں، اور جنکی نگاہ میں اس آزادی کے منافع اسقدر قیمتی ہیں کہ اپنی اسلامی حیثیت کو وہ بخوشی ان پر قربان کرسکتے ہیں، وہ اس راستہ پر ضرور جائیں مگر ہم یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ کوئی سچا مسلمان ایسی تحریک آزادی وطن میں جان بوجھ کر حصہ لینا گوارا کرے گا۔

ہم کیسی آزادی چاہتے ہیں

آزادی وطن کیلیے دوسرا راستہ صرف وہی ہوسکتا ہے جس میں کسی باشندہ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت اور اس کے مسلم یا ہندو یا عیسائی یا سکھ ہونیکی حیثیت میں کوئی تناقض نہ ہو، جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو، جسکی نوعیت یہ ہو کہ مشترک وطنی مسائل کی حد تک تو امتیاز مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے، مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کرسکے، اور ہر قوم کو آزاد ہندستان کی حکومت میں اتنی طاقت حاصل ہو کہ وہ اپنے ان مسائل کو خود حل کرنیکے قابل ہو۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، ہندوستان کی آزادی کیلئے جنگ کرنا تو ہمارے لیئے قطعاً ناگزیر ہے، لیکن ہم جس قسم کی آزادی کے لیے لڑ سکتے ہیں اور لڑنا فرض جانتے ہیں، وہ یہی ہے۔ رہی وہ آزادی جو "وطن پرستوں" کے پیش نظر ہے، تو اسکی حمایت میں لڑنا کیا معنی، ہم تو اسے انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ معیوب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اسکے علمبردار مسلمانوں کے لیئے وہی کچھ ہیں جو

کلائیو اور ولزلی تھے، اور انکے پیرو مسلمان کسی حیثیت سے بھی میر جعفر اور میر صادق سے مختلف نہیں ہیں۔ گو صورتیں اور حالات مختلف ہیں مگر دشمنی اور غداری کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں[1]۔

کانگریس کی طرف بلانے والوں کی غلطی | اب سوال یہ ہے کہ یہ آزادی جسکو ہم اپنا مقصود بتا رہے ہیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں میں آج کل دو گروہ نمایاں ہیں جو دو مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادیٔ وطن کے لیے جو جماعت جد و جہد کر رہی ہے اسکے سامنے اپنے مطالبات پیش کرو اور جب وہ انہیں منظور کر لے تو اسکے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلا کسی شرط کے اس آزادی کی تحریک میں حصہ لو۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر اس نے مطالبہ کیا اور انہوں نے مان بھی لیا تو نتیجہ کیا نکلیگا؟ جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں اسکو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں

---

[1] بعض حضرات نے اس فقرے کی سختی کی شکایت کی ہے۔ ان کے اطمینان قلب کے لیے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس فقرے میں میرا روئے سخن ان لوگوں کی جانب نہیں ہے جو سچے مسلمان ہیں اور محض اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں دو قسم کے لوگوں کو میر جعفر و میر صادق سے تشبیہ دے رہا ہوں۔ ایک وہ جن کے دلوں سے درحقیقت اسلام نکل چکا ہے مگر وہ مسلمانوں کے بھیس میں رہ کر امتِ مسلمہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اپنی اغراض کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور جو ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سجدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اپنی قوم کی اُن بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنہیں گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل کیساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اگر ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں، اور مسلمان درحقیقت اسقدر طاقتور ہیں کہ جدید نیشنلزم سے انکی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، تو ہم اپنی رائے واپس لینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور ہم یقین کیساتھ کہتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر صاف سُن لیجیے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا دراصل انکو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ محض جذبات سے اپیل کر کے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جس مریض کی آدھی جان نکل چکی ہے اسکے سامنے سپہ سالار بنکر آنے سے پہلے آپکو حکیم بنکر آنا چاہیئے۔ پہلے اس کی نبض دیکھیے اور اسکے مرض کا علاج کیجیے۔ پھر اسکی کمر سے تلوار بھی باندھ لیجیے گا۔ یہ کہاں کی ہوشمندی ہے کہ مریض تو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اُٹھ بہادر! اپنی طاقت کے بل پر کھڑا ہو، باندھ کمر سے تلوار اور چل میدانِ کارزار میں!

یہ دونوں راستے جن لوگوں نے اختیار کیے ہیں ان میں متعدد حضرات ایسے ہیں جن کے لیے ہمارے دل میں غایت درجہ کا احترام موجود ہے۔ ان کے خلوص ایمان میں ہمکو ذرہ برابر شک نہیں۔ مگر ان کی جلالت شان کا پورا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں، اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور و خوض نہیں کیا ہے۔

چند غور طلب حقائق ہمارے رہنماؤں کو قدم اُٹھانے سے پہلے حسب ذیل حقائق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔

(۱) مسلمانوں کی حیات قومی کو برقرار رکھنے کیلیے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جسکو آج کل سیاسی

اصطلاح میں "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" (Imperium in imperio) کہا جاتا ہے، انکی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود انکی اپنی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئتِ حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظام حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔

(۲) اٹھارویں صدی کے سیاسی انقلاب نے ہمکو اس چیز سے محروم کر دیا۔ اور اسکی بدولت جو اضمحلال ہماری سوسائٹی میں رونما ہوا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف لیجانے کے بعد یہ انقلاب ہمکو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ، ہمارے اخلاق تباہ، ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار، اور ہمارے دین و اعتقاد تک کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

(۳) اب ایک دوسرے انقلاب کی ابتدا ہو رہی ہے جس میں دو قسم کے امکانات ہیں ۔ اگر ہم نے اسی غفلت سے کام لیا جس سے گذشتہ انقلاب کے موقع پر کام لیا تھا، تو یہ دوسرا انقلاب بھی اسی سمت میں جائیگا جس میں پہلا انقلاب گیا تھا، اور یہ اس نتیجہ کی تکمیل کر دیگا جسکی طرف ہمیں اسکا پیشرو لے جا رہا تھا۔ اور اگر ہم غیر مسلم نظام حکومت کے اندر ایک مسلم نظام حکومت (خواہ وہ محدود پیمانہ ہی پر ہو) قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انقلاب اپنا رخ بدل دیگا اور ہمیں اپنے نظم اجتماعی کو پھر سے مضبوط کر لینے کا ایک موقع ہاتھ آ جائیگا۔

(۴) سلطنت کے اندر ایک سلطنت قائم کرنا کسی سمجھوتے اور کسی میثاق کے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ کوئی غیر مسلم سیاسی جماعت، خواہ وہ کتنی ہی فیاض اور وسیع المشرب ہو، اسکے لئے بخوشی آمادہ نہیں ہو سکتی، نہ اسکو بحث و مباحثہ کی طاقت سے کسی دستوری قانون میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔ اور بالفرض اگر یہ

ہو بھی جائے تو ایسی ایک غیر معمولی چیز جس کی پشت پر کوئی طاقتور پائے عام اور منظم قوت موجود نہ ہو عملی سیاست میں نقش بر آب سے زیادہ پائدار نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ چیز اگر کسی ذریعہ سے پائدار بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نظام کی قوت اور اپنے ناقابل تسخیر متحدہ ارادہ سے اسکو بالفعل قائم کر دیں اور یہ ایک ایسا حاصل شدہ واقعہ (Accomplished fact) بنکر ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کا جز بن جائے جس کو کوئی طاقت واقعہ سے غیر واقعہ نہ بنا سکے۔

(۵) یہ کام اس طرح انجام نہیں پا سکتا کہ ہم سر دست انقلاب کو اسی رفتار پر چلنے دیں اور اسکی تعمیل ہونے کے بعد جب ہندوستان میں مکمل طور پر ایک غیر مسلم نظام حکومت قائم ہو جائے اسوقت سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ اس چیز کو صرف وہی شخص قابل عمل خیال کر سکتا ہے جسکو عملی سیاست کی ہوا تک چھو کر نہ گذری ہو۔ ایک ہوش مند آدمی تو بادنیٰ تامل یہ سمجھ لے گا کہ انقلاب کا رخ صرف دوران انقلاب ہی میں بدلا جا سکتا ہے، اور سلطنت کے اندر سلطنت صرف ایسی صورت میں بن سکتی ہے جبکہ سلطنت کی تعمیر کے دوران میں اس کی بنا ڈال دی جائے۔

(۶) جس قسم کی تنظیم اس مقصد کے لیے درکار ہے وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر نہیں کی جا سکتی کانگریس ایک منظم جماعت ہے، اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرہ میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر مضبوط اسلامی کیرکٹر اور طاقتور اجتماعی نظم موجود ہو تو البتہ وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر اس کے نفسیات اور اصول و مقاصد میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس وقت وہ جن کمزوریوں میں مبتلا ہیں (جن کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے) ان کو لیے ہوئے منتشر افراد کی صورت میں ان کا ادھر جانا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگریسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے، وہ اکابر کانگریس کی رہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشاروں پر چلنے لگیں، اور اسلامی مقاصد کے لیے مسلمانوں میں ایک رائے عام تیار کرنے کے جو امکانات ابھی باقی ہیں

وہ بھی ہمیشہ کیلیے ختم ہو جائیں۔ ہر شخص جسکو خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہے، اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ "نیشنلسٹ" قسم کے مسلمان اگر کانگریس کے اندر کوئی بڑی قوت پیدا کرلیں اور حکومت کے اقتدار میں انہیں کوئی بڑا حصہ مل جائے تب بھی وہ مسلمانوں کیلیے کچھ مفید نہ ہونگے، بلکہ غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہی نقصان رساں ثابت ہونگے، اس لیے کہ وہ ہر معاملہ میں پالیسی اور طریق کار تو وہی اختیار کرینگے جو ایک غیر مسلم کریگا، مگر ایسا کرنے کے لیے انکو اس سے زیادہ آزادی اور جرأت حاصل ہوگی جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے کہ بدقسمتی سے انکے نام مسلمانوں کے سے ہونگے۔

اسلامی جماعت کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری تدابیر

مذکورۂ بالا حقائق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کرینگے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں، اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول بھی ممکن ہو ——— اس غرض کے لیے ہم کو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنی چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصولِ اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے، اور انکے اندر کم از کم اتنی واقفیت پیدا کردی جائے کہ وہ اسلام کے حدود کو پہچان لیں اور یہ سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کن خیالات اور کن عملی طریقوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کن کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نشر و تبلیغ صرف شہروں ہی میں نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ دیہات کے مسلمانوں کو شہری مسلمانوں سے زیادہ اسکی ضرورت ہے۔

۲- علم کی اشاعت کیساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکام اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کیجائے اور خصوصیت کیساتھ ان ارکان کو پھر سے استوار کیا جائے جن پر ہمارے نظام جماعت کی بنیاد قائم ہے۔

۳- مسلمانوں کی رائے عام کو اس طرح تربیت کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے

پر مستعد ہو جائیں، اور ان کا اجتماعی ضمیر (Social conscience) احکام اسلامی کے خلاف افراد کی بغاوت کو برداشت کرنا چھوڑ دے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز کے استیصال پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ تشبہ بالاجانب ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ہم کو غیروں میں جذب ہونے کیلئے تیار کرتی ہے۔

۴۔ ہمیں اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہئے کہ اپنی جماعت کے اُن غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں جو اپنے دل کے چھپے ہوئے کفر و نفاق کی وجہ سے یا ذاتی اغراض کی خاطر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۵۔ ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ جمہور مسلمین کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے، نہ ہندو کے غلاموں کو، بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں جائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری ہمسایہ قوموں کیساتھ اشتراک عمل کرنے پر کھلے دل سے آمادہ ہو، مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

۶۔ مسلمانوں میں اسقدر اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تنِ واحد کیطرح ہو جائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

اسوقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اسکو دیکھتے ہوئے شاید بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ خود میرے متعدد دوستوں نے کہا کہ تم خیالی پلاؤ پکا رہے ہو۔ یہ قوم اسقدر گر چکی ہے کہ اب کوئی اعجازی قوت ہی اسکو سنبھالے تو سنبھالے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا ایک موقع، آخری موقع باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں، مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اور وہی ہمارے لیے آخری شعاعِ امید ہے۔ قبل اسکے کہ وہ بجھے، ہم اس سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں، بشرطیکہ چند مردِ مومن ایسے اُٹھ کھڑے ہوں جو خلوص نیت کیساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنیوالے ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کیلیے ہمکو بالآخر کانگریس کیساتھ تعاون کرنا ہے۔ لیکن سردست ہم اس سے صرف اسلیے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونیکی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کیلیے ہمکو جس اخلاقی قوت اور اجتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ سب سے پہلے ہم اپنی ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس غرض کیلیے ہمکو ایسی فضا درکار ہے جو مزاحمت اور تصادم سے پاک ہو۔ پس اگر کانگریس ہم سے تعرض کیے بغیر اپنا کام جاری رکھے تو ہمیں اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے برعکس ہماری ہمدردیاں مشترک ہندوستانی مقاصد کی حد تک اسکے ساتھ رہیں گی۔ البتہ اگر وہ ہماری غیر منظم جماعت کو اپنے نظم میں جذب کرنیکی کوشش کرے گی، اور براہِ راست ہمارے عوام میں "وطن پرستی" اور "اشتراکیت" کی تبلیغ شروع کردے گی، اور اس غرض کیلیے ہماری قوم کے ان منافقوں سے کام لے گی جنکی حیثیت ہماری نگاہ میں دوسری قسم کے منافقوں (یعنی انگریزی اقتدار کے ایجنٹوں) سے کچھ بھی مختلف نہیں تو اس صورت میں ہمکو مجبوراً اس سے لڑنا پڑیگا، اور اس لڑائی کا تمام تر الزام خود اسی پر عائد ہوگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو، اپنی موجودہ پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کیلیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو تبدیلِ خیال (Conversion) پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا ہر جماعت کا حق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر آپکو یہ حق حاصل ہے تو ہمکو بھی جوابی تبلیغ کا حق پہنچتا ہے۔ وطن پرستی اور اشتراکیت کی تبلیغ ہماری نگاہ میں شدھی کی تبلیغ سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔ اور دونوں کی مزاحمت ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ اگر آپ اس تصادم کے لیے تیار ہیں، اور اسکو ہندوستان کے مستقبل کیلیے مفید سمجھتے ہیں تو یہ آپکی سخت نادانی ہے۔

مسائل حاضرہ میں قرآن اور اسوۂ رسول کی رہنمائی

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ (الاعراف - ۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے لگو۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (آل عمران - ۴)

اے نبی کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو دوست بنا لے گا اور تمہیں بخش دے گا۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا - (الاحزاب - ۳)

تمہارے لئے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے جو کوئی اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو، اور آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد رکھنے والا ہو اس کے لیے (تو پیروی کا صحیح نمونہ وہی ہے)

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، یا جنہوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گذری ہونگی۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہوگی۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی خطبہ خالی نہیں ہوتا مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایکبار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں، کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے۔

مجملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونیکے ہمکو قرآن اور اسوۂ رسول ہی کا اتباع کرنا چاہئے۔ اور ہمارے لئے ہدایت انہی دو چیزوں میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جسکے اتباع کا حکم اس قطعیت کیساتھ ہمکو دیا گیا ہے آیا اسکا دائرہ صرف طہارت اور استنجا اور عبادات اور (باصطلاح زمانۂ حال) "مذہبی" معاملات ہی تک محدود ہے یا تمہاری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لیے تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، یا درحقیقت یہ زمانی و مکانی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لیے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لیے تھی؟ اگر پہلی بات ہے، تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کر کے صرف اس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنیکے بجائے تمکو اپنے ایمان ہی پر نظرثانی کرنی پڑے گی لیکن اگر بات دوسری ہے، تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اُس سرچشمۂ ہدایت کیطرف رجوع کرتے ہو مگر جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کونسا راستہ دکھاتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے

انتشار خیال و تشتت عمل | ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے مستقبل کا سوال ایک درشتی ہنڈی کیطرح مسلمان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کر دو یا دیوالہ نکالو لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جسکا جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے اور جس کے ذہن میں جو بات آرہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی

مارکس اور لینن کے اُسوے کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے، کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے، کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے، کوئی فرائض کی پُرانی فہرست میں ایک نئے فرض (جنگ آزادی) کا اضافہ کر رہا ہے، کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے، کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر لیشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانیوالی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لیے کہ منزل مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہٖ مقصود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سُنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اور ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملے میں تمہارے لئے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔

ہدایت صرف کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں ہے | مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علماء ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زبان آور خطیب اور ماہر فن انشا پرداز ہیں۔ ہر وادی کے سرے پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جنکی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمات ناقابل انکار، اور سیاسی مہارت و بصیرت معروف و مشہور ہے۔ ہر رہنما بڑی قابلیت کیساتھ اپنے راستے کے نشیب و فراز دکھا رہا ہے اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بہت قابلِ قدر ہے مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے کہ ایتونی بشیئًا من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتی اقول۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم و فاضل ہو، مفسر قرآن ہو، معلم حدیث ہو، ماہر سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اسکی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر، مگر جو ہدایت وہ دے رہا

ہے اگر وہ اسکے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لیے لائق اتباع نہیں۔ ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں سے کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کر کے اسکو اور صرف اسکو سامنے لاؤ۔ اس لیے کہ وہی لائق اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی میں فلاح و نجات ہے۔ اسکے بتائے ہوئے راستے میں خواہ کتنے ہی خدشات ہوں، کتنی ہی دشواریاں اور کتنے ہی نقصانات ہوں، آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آئیے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرت محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اسوقت کے قومی مسائل میں اسکے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پرواہ نہیں اگر کوئی اس بات کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید ہیں، جغرافی ماحول مختلف ہیں۔ مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانے میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

بعثت محمدی کے وقت عرب کی حالت اور حضورؐ کا طرزِ عمل ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپکے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اسوقت عرب ہر طرف امپیریلیسٹ طاقتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپ کی پیدائش سے چند ہی روز پہلے حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ یمن پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیر اثر تھے۔ عراق عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ معان تک بلکہ تبوک تک سلطنت روم کے اثرات پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض

کیلئے ایک دوسرے سے لڑاتی رہتیں اور اندرون عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی، کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا، مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کیلئے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے کیا کیا؟ اگرچہ آپکو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی، اور آپ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا۔ مگر آپ نے ایک قوم پرست (Nationalist) یا وطن پرست (Patriot) کی حیثیت اختیار نہ کی بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی۔ آپکی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہل وطن کی قوت کو مجتمع کر کے اجنبی استیلاء کی جڑیں خاک وطن سے اکھاڑ پھینکیں بلکہ ہر دوسرے کام سے مقدم یہ کام تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں اور انکے اندر ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلاء کا خاتمہ کر دے۔ آنحضرت کے اہل وطن آپکے بہترین اوصاف سے واقف تھے۔ انہوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپکے سامنے پیش کیا تھا اس شرط پر کہ آپ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آجائیں۔ اگر آپ وطن پرست ہوتے تو خدمت وطن کا موقع اس سے بہتر اور کونسا ہو سکتا تھا؟ مگر آپ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا اور اسی کام میں لگے رہے جسکے بار آور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ کر سکتا تھا۔ اس وقت آپکی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپکا ساتھی نہ تھا بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے۔ ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہو گی جسکو آپ لے کر اٹھے تھے۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعۂ فیل کیطرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آجائے اور حجاز بھی یمن اور ارض غسان کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے۔ مگر آپ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا

کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو بڑھائیں اور مضبوط کریں، پھر جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کیساتھ کوئی معاملہ کریں۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ "کمیونلسٹ" تھے؟ کیا آپ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے؟ کیا خاکم بدہن آپ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے؟ ہرگز نہیں۔ تاریخ کے ناقابل انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزند وطن نے اپنے وطن کو اتنی سربلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعی دین نے غیر مذہب والوں کیساتھ اتنے تحمل، اتنی فیاضی، اتنی رواداری اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسول نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال ہی نہیں اٹھایا۔ آپ نے نہ کبھی مکی زندگی میں اس بنیاد پر مصالحت کی کہ ریاست قریش کے دارالندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدار صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصہ ہو۔

اب غور کیجیے کہ جب وہاں نہ کمیونلزم تھا نہ وطن دشمنی تھی نہ اعدائے وطن سے ساز باز تھا، تو پھر کون سی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات، تمدنی و معاشی فلاح پر اپنی بہترین قوتوں اور قابلیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنانا اور زمین میں اسکا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرست کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل و ابولہب دونوں یکساں سد راہ تھے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنیکے لیے ناگزیر تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آئندہ کے امکانی خدشات، سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو

منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے، اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کردے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل پھول سکے۔ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

وہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے ہیں۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اس بنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو سلب کر لیجیے پھر مسلمان تو محض کسی قوم کا نام نہیں ہے۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اسکا نصب العین ہے۔

مسلمانوں کو کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟ اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالیے۔

یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، اسکی بنیاد کسی مادر وطن کی فرزندی، کسی نسل انسانی کے انتساب، کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی، بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرزِ عمل پر تھی۔ اسکو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادی مقاصد کی بندگی۔ اسکی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ، اذان کا نعرہ تھا نہ کہ وطنیت کا نعرہ۔ اس کے اجزاء کو سمیٹ کر ایک بنیان مرصوص بنانے والی چیز ایک ان دیکھے خدا کی عبادت تھی نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت۔ اسکو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب۔ اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و وطن کو سربلند کرنے کی تمنا۔

اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں۔ جو چیزیں دوسروں کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس

قوم کے دل میں الٹی نفرت پیدا کر دیتی ہیں ــــــ جن مرئی علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں یہ اُنکے لیے کوئی جذبۂ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے ــــــ جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ انکے دلوں میں الٹی سردی پیدا کر دینے کا اثر رکھتی ہیں ــــــ جو چیزیں دوسروں کو عمل پر ابھارنے والی ہیں وہی انکو میدان عمل سے دور بھگانے والی ہیں۔ سامنے قرآن کو اٹھا کر دیکھ جاؤ، پوری سیرت نبوی پر نظر ڈال لو، خلافت راشدہ کے دور سے اس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے۔

جو قوم اس سوال پر صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبی پر سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں، کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سننے کیلیے تعظیماً کھڑی ہوگی؟ جس قوم کے دل میں مرئیات سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے کیا تمہیں امید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جھکا کر سلامی دیگی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پر بلائی جاتی رہی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پر پروانہ وار دوڑی چلی آئیگی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنیوالا داعیہ اب تک محض اعلائے کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے، کیا تمہارا گمان ہے کہ اب معدہ اور بدن کے مطالبات اسمیں حرارت پھونک سکیں گے، یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اسکے قلب و روح کو گرما دیگا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پر جمع کیا گیا تھا، کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقت ور عملی قوم بن جائیگی؟ تخیل کی بنیادوں پر نظریات کی عمارتیں اٹھانے والے جو چاہیں کہیں، مگر جس کسی نے قرآن اور سنت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے وہ بادنیٰ تامل یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آسکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلا شبہ ان ذرائع سے جمع ہو جائینگے اور ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائیگی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے

والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ انکا مذہب انکو منتشر کرتا ہے اور صرف وطن کی خاک ہی انکو جمع کرتی ہے۔ انکے معتقدات انکے دلوں کو سرد کرنیوالے ہیں۔ ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ مگر مسلمان جسکو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا اور جس میں ایمان کی گرمی پھونکی گئی تھی، آج تم اسکو ذلیل مادی چیزوں کے نام پر جمع نہیں کرسکتے، اور نہ ادنیٰ درجے کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کرسکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب ہوسکتی ہے تو صرف اسوقت جبکہ تم مسلمان کو فطرتِ اسلام سے ہٹا دو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی اصلاح و ترقی کیلیے کیا کچھ نہیں کیا؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ کم خدمت کی؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے کیا انہوں نے اسکو جنت بنا کر نہیں چھوڑا؟ غیر مسلم قوموں کیساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی؟ پس اوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدنی مسائل سے بالکل بے پرواہ ہے بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوتِ محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں، اسکی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی، اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنیوالی آگ یہ نہیں ہے۔ وہ طاقتور اور منظم ہونیکے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصہ لے سکتا ہے، مگر اسکو طاقتور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ اور ہیں۔

مسلم قوم کس طرح بنائی گئی تھی؟ اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ یہ دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوتِ عمل پیدا کی تھی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لیکر اٹھے تھے تو ساری دنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی۔ گرد و پیش جو لوگ آباد تھے ان میں خود سری اور انفرادیت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔

ان میں سے کوئی کسی کی بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کے سوا کسی اور عصبیت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے کوئی دور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جنکی تبلیغ کیلیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے۔ اس ماحول اور ان حالات میں کونسی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان، بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا؟ کیا آنحضرتؐ نے عربوں کو یہ لالچ دلایا تھا کہ میں تمکو زمین کی حکومت دلواؤنگا؟ رزق کے خزانے دلواؤنگا؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشونگا؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کرونگا اور عرب کو ایک طاقتور سلطنت بنا دونگا؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دونگا؟ تمہارے وسائل معیشت بڑھاؤنگا اور تمہیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بنا کر چھوڑونگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ آپ نے نہیں دلایا تھا۔ پھر کیا آپ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرت نبویؐ گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپ نے کوئی سیاسی یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا فوجی تحریک اٹھائی تھی اور اسکی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لیے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجیے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپ کی طرف کھینچا؟ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں، ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا کہ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ۔ ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ انکے سامنے نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ پھر جس شخص نے انکو یہ دعوت دی تھی اسکا حال یہ تھا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنَ ۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھکر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضیلت اخلاق اور عمل صالح کا مجسمہ تھا، اور اسکی زندگی میں راست بازی اور راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہی دو چیزیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنادی جسکا نام مسلمان ہے نوع انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کیلیے ان دو چیزوں میں کشش تھی، وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انہی سے مسلمان قوم وجود میں آئی۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھیے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرت نبوی کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔ جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہونگے جو قرآن نے پیش کیے ہیں، اور جہاں طرز عمل وہ ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہاں "مسلمان" جمع ہو جائینگے، اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہونگی وہاں اُن لوگوں کیلیے قطعاً کوئی کشش نہ ہوگی جو "مسلمان" ہیں۔

مسلمانوں کی قومی تحریکات کے ناکام ہونیکی وجہ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری قومی تحریکات میں بنیادی نقص کونسا ہے جسکی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور ہر داعی کی آواز بہرے کانوں سے سنتے ہیں۔ انکی فطرت وہ آواز سننا چاہتی ہے اور وہ طرزِ عمل دیکھنا چاہتی ہے جسکی کشش نے انکو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا۔ مگر افسوس کہ نہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے اور نہ وہ طرزِ عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بلانے والے انکو ایسے مقاصد کی طرف بلاتے ہیں جو انکی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ علو اور تمکن فی الارض کی طرف آؤ۔ حالانکہ یہ مسلمان کا نصب العین نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین (اعلائے کلمۃ اللہ) کیلیے اسکی بے غرضانہ جد و جہد کا طبعی نتیجہ ہے۔ کوئی انکو وطن پرستی کیطرف بلاتا ہے، حالانکہ اسی چیز کو چھوڑ کر تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے گرد جمع ہوئے تھے۔ کوئی انکو نہایت ادنی درجہ کے مادی فوائد کیطرف بلاتا ہے، حالانکہ مسلمان کی نگاہ میں انکی حیثیت متاع غرور سے زیادہ نہیں۔ پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کیلیے اٹھتے ہیں انکی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمت دین اور باطن میں خیانتیں، غداریاں اور اغراض نفسانی کی بندگیاں۔ جنھو مسلمین بڑی بڑی امیدیں لیکر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی نیتیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر انکے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے طریق تنظیم پر غور کیجیے کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

اسلامی تنظیم کے اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت اس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپ نے انسانی گروہ میں سے صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جنکی فطرت میں ایک خالص صداقت اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، انکے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا دیا، اور انکے کیرکٹر میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اس مقصد کیلیے جم کر جد و جہد کرتے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف انہیں اس مقصد کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اسکے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں، جماعت کی طاقت انکو دور کر دے۔ اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں اور برائیاں ابھر نہ سکیں۔ افراد اپنے مقصد حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار ہوں، اور اجتماعی طاقت سے اسکو حاصل کرنیکی کوشش کریں۔ اس تعمیر کی شکل بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہر فن انجینیر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے، پھر

انکو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے۔ پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے۔

ا۔ جماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر مضبوطی کیساتھ قائم رہ سکیں۔

۲۔ اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کیجائے۔

۳۔ جماعت کے تمدن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کیے جائیں جن سے وہ دوسری قوموں میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں۔ اسی لیے تشبہ بالاجانب کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی۔

۴۔ تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھایا ہے تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت راہ نہ پا سکے۔ سرکشی کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی اسکا استیصال کر دیا جائے اور منافقین کیساتھ غلظت اور شدت کا ایسا برتاؤ ہو کہ یا تو وہ جماعت سے نکل جائیں یا اگر رہیں تو کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں۔

۵۔ پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو، اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو مجرد اسلامی حق کی بناء پر اسکی رکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل ہو ـــــــ ایسے تمام انتسابات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔ ہر فرد مسلم کو قومی معاملات میں حصہ لینے اور رائے دینے کا پورا حق حاصل ہو، حتیٰ کہ اگر ایک غلام بھی کسی کو امان دیدے تو وہ پوری قوم کی طرف سے امان ہو۔

۶۔ جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اسکے لیئے جد و جہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو ـــــــ ایک گروہ صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لیئے وقف رہے اور بقیہ افراد جماعت اپنی معاش کے لئے جد و جہد کرنیکے ساتھ ساتھ پہلے گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں اور مجموعی طور سے

پوری جماعت اور اسکے ہر ہر فرد کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اسکی زندگی کا اصل مقصد روزی کمانا نہیں بلکہ اسی ایک نصب العین کی خدمت کرنا ہے۔

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دنیا پر چھا گئی — اس طریق تنظیم کی رفتار ابتدا میں بہت سست تھی حتیٰ کہ پندرہ برس تک چند سینکڑوں سے زیادہ افراد کو اپنے دائرہ میں نہ لا سکی مگر اسمیں یہ قاعدہ مدنظر رکھا گیا تھا کہ توسیع (Expansion) کیساتھ ساتھ استحکام (Consolidation) بھی ہوتا ہے اسلیے یہ نظام جماعت جتنا پھیلتا گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا یہانتک کہ جب ایک معتد بہ جماعت اس طریق پر منظم ہو گئی تو وہ اتنی طاقت کیساتھ اٹھی کہ دنیا کی کوئی چیز اسکے سیل رواں کو نہ روک سکی — قرآن مجید میں اسکی چھوٹی سی ابتدا پھر تدریجی ترقی اور پھر غیر معمولی شان شوکت کیساتھ اسکے ظہور کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔

مسلمان قوم کے مزاج کیساتھ یہی طریق تنظیم مناسبت رکھتا ہے یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے — اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت، یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے انکے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ انکو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے — لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لے لیے ہیں، مگر انکو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آسکتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو وہ ایک ایسی جمہوری تحریک ہے جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کیجائے اور جسمیں توسیع و استحکام کے باہمی تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا تھا۔ آپ اگر کچے اور کمزور مسالے سے ریت کی سطح پر ایک بڑی عمارت کھڑی کر دینگے اور اس سے قلعے کا کام لینا چاہیں گے تو لامحالہ وہ سیل حوادث کی ایک ٹکر بھی نہ جھیل سکیگی۔

اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے

دین و دنیا کی علیحدگی کا جاہلی تصور اور اسکے اثرات ہماری قومی سیاست میں

مذہب کا جاہلی تصور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کیساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کیلئے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اسکا تعلق کلیۃً صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اسکے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مراتب حاصل کرنے ہوں اسکے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بےتعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے۔ مگر جسکو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ محض نجات مطلوب ہو، اور اسکے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظرِ عنایت رکھے اور انکو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اسکے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کیساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور انکے ساتھ ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے، اور اسکا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اسکی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں۔ اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب

و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی علائق سے نفرت، الذات دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کیلیے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جسکی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا، اسکو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس نے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی سے گندی اور بدتر سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اسکے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جنکو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوئی ہے۔

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے، اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ——— جنکو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے ——— جس طرح چاہا چلایا اور اسکے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبودوں کو خوش کرنے کیلیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ انکے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا، اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں، اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کیساتھ یہ ضمیمہ نبھ سکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ

دیا، جہانسوزی اور غارتگری کا بھی، سود خواری اور قمار و بنٹ کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

مذہب کا اسلامی تصور

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کیلئے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو ہٹا کر ایک عقلی و فطری تصور پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کیساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اسکی قوت محرکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنیوالی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہ راست اور راہ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہ کج سے بچائے، راہ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں، جو دنیا سے لیکر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کیساتھ گذار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کیلئے نہیں آیا ہے، بلکہ اسکے آنیکا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اسکو بھی پرانے جاہلی تصور کے تحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جسقدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسیقدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسیقدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اسکے آنیکا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں اور انکی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں، اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب

زندگی کیلئے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے، اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

اسلام ایک خاص طریقِ فکر (Attitude of mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (Outlook on life) ہے ــــــــــ پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جسکا راستہ اسی طریقِ فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے، جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، قوم و ملت کے، ملک و وطن کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے، اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کیساتھ ادا کریگا، بغیر اسکے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔

پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے نظر معین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو خواہ وہ کسی میدان میں ہو ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کیطرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کیجاتی ہے۔

اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر
لیا جاتا ہے، اور جو شے سدراہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات
سے لیکر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی
فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، طہارت میں، صنفی تعلقات میں، لین دین
میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکز مقصود
کی طرف جانیوالی سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اسکا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ
اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت
سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقا ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزل مقصود کیطرف جانے والے
ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانیوالی ہوں۔ اسکا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان
کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں
سے استعمال کرے تاکہ وہ اسکے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اسکی
کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں
کیساتھ دوستی میں، اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں،
غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدن کے لین دین
میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں، وہ اپنے مقصد کی
راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی
طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے
اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروان اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لیکر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت

سے لیکر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجا کے جزوی مسائل سے لیکر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لیکر آثار فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزا میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ انکی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا، اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کسقدر آگے بڑھ چکی ہے۔ مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اسکی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے "تاریک" حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دینداری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے اور تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان نور علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم اپنے قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

فہم و ادراک کے اس قصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ | **ہماری سیاست میں جاہلی تصور کے اثرات**

کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دُنیا کے سامنے اسلام اور اسکی تہذیب تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جنکے حل پر اسکی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے، اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان اور یہ کہتے وقت انکے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام، اور پھر پنجابی، بنگالی، دکنی اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے، زندگی کا ایک جداگانہ نقطۂ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی، اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے اس لیے کہ اسلام ایک مذہبی "ضمیمہ" ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں یعنی اعتقادات اور عبادات۔ ان کی حد تک مسلمان اپنی الگ راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات، تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ انکو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی تمدنی اور لسانی حقوق کے لیے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک مشترک نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے انکو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبعی کی دریافت، اور تنظیم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، اس لیے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں وہی انکے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہ میں کام کرتا ہے، اور جو اپنے طریق فکر و زاویہ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا راستہ، اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے، سو وہ انکی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ——— وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمنی، یا اطالوی، یا فاروقی و خالدی، انکو اس سے کوئی بحث نہیں۔ انکے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی ذہن" ہیں، کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ انکو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ انکی نگاہ میں جسکو "زمین کی وراثت" حاصل ہے وہی "صالح" ہے اگرچہ وہ ابراہیم کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے، وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیح کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اسکی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ انکے مذہب اور "پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان

دلا دیا جائے، انکی زبان کو اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے، اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں تناسب نمائندگی انکے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اسوقت تک نہ ہوگا جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت اسکو قبول نہ کرے تو انکے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں، مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اسی جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمہ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اسکی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہے، ہم اسکو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اسکو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونیکا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو جو قرآن کا طریق فکر ہے ——— زندگی اور اسکے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو جو قرآن کی نظر ہے ——— تم اشیاء کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق متعین کرو جو قرآن نے اختیار کیا ہے ——— تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے ——— تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تمکو ملا ہے۔

اگر تمہارے ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی، اور تمہاری نفسیات، قرآنی نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے یا رہنے پر مجبور نہیں کرتا عقل اور راست بازی کا اقتضا یہ ہے کہ تمکو اس دائرے کے باہر اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے، اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد کر لیتے ہو تو پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن — کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے — جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادی وسائل اور قوانین طبیعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریق فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لئے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصولوں کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے۔ جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے، اور اسکے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔ آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپکو اختیار کرنی پڑیگی اور ہر اس اسکیم کو رد کر دینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اسکے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا — آپ زندگی کے پہلے مرحلہ میں دنیا کو جس طرح برتیں گے ، دوسرے مرحلہ میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہونگے — اسلام کا مقصد آپکے ذہن اور آپکے عمل کو اسطرح تیار کرنا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برتیں تاکہ دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے ، اور اسمیں اعتقادات و عبادات سے لیکر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں تو یہ جزوی ارتداد ہے جو آخر کار کلی ارتداد پر منتہی ہوتا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقدات دینی اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں ، مگر اس نظام زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جسکی عمارت انہی معتقدات اور انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو اسکا ارادہ نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اَفَتُؤمِنُونَ بِبَعۡضِ الۡکِتَابِ وَتَکۡفُرُونَ بِبَعۡضٍ کا مصداق ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجزیہ کر کے دائرۂ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرے میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے۔ کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونیکے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصول حیات پر ایمان لانیکے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا جو قدم قدم پر ان اصول حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

بخلاف اسکے اگر آپ اس اسکیم کے مطابق اپنی سیاسی اور معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپکو الگ پارٹیوں میں منقسم ہونیکی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی

پارٹی ــــ حزب اللہ ــــ ان سب کاموں کے لیے کافی ہے کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ انکے درمیان موافقت اور اشتراک عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ ان اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنیکی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں اور اگر مجبوراً تنازع طبقات (Class war) کی آگ میں کودتے ہیں تو آپ کیوں انکے پیچھے جائیں؟

اسیطرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں، علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے۔ دوسرا وہ تھا جو صحابۂ کرام اور قرون اولی کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیر عناصر استعمال اسباب اور قوانین طبیعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، اگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں کی روحوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں، مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد ــــ بُعد المشرقین ــــ ہے اسکو کہیں دیکھتے۔ دنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن اُس تسخیر عناصر اور استعمال اسباب کا نتیجہ ہے جسکی تہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اسکے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے، وہ بھی اگرچہ تسخیر عناصر اور استعمال اسباب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، مگر اسکی تہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو، اور جب تک کہ زندگی کی ساری جدوجہد اس الٰہی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جسکی گرفت کو مضبوط کرنیکے لئے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے ــــ وہی ارکان اسلام جنکو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور انکے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کیجا رہی ہے

اسکی تہ میں بھی وہی جہل کار فرما ہے جسکے مظاہر آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری اسکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں۔ اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے ہیں اسکا اپنی اصل پر باقی رہ جانا، اور آپکی زبان کا اپنے رسم الخط کیساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا اسلیئے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزا کسی طرح کھپ نہ سکینگے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائینگے۔ پھر ان اجزاء کی حفاظت جن نمائندوں کے ہاتھ میں آپ دینا چاہتے ہیں وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی کہ غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف ۳ نہیں ۹۹ کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کیلئے اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت کانگریس نے اپنا "بنیادی حقوق" (Fundamental rights) والا ریزولیوشن مرتب کیا ہے، اور اسی تصور جاہلیت کے تحت اپنی بجنور والی تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ "کانگریس کسی کے مذہبی عقیدے اور مذہبی روایات میں قطعاً دخل نہیں دے سکتی۔ کانگریس کو مذہب میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایسا کرے گی۔ کانگریس ہندوستان کے مذاہب کی آزادی، مذہبی لوگوں کی تہذیب کی آزادی، تمدن کی آزادی اور زبان کی آزادی کی حامی ہے"[1] پھر جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت مسلمانوں کا ایک گروہ اس قسم کے اعلانات کو کافی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے اعلانات پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کانگریسی رہنما تو خیر غیر مسلم ہیں اور مذہب کے صرف اسی تصور سے واقف ہیں جو انہیں وراثت میں ملا ہے اگر مسلمانوں کے سیاسی رہنما بھی اسکے ساتھ بدقسمتی سے مذہبی رہنما بھی شریک ہو جاتے ہیں) اس سلسلہ میں جس ناواقفیت

[1] جمعیت علماء کے ہند کے ناحد ترجمان "الجمعیۃ" مورخہ ۲۲ شعبان ۱۳۵۶ھ میں یہ تقریر "صدر کانگریس کا اعلان حق" کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔

کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر "مذہب" یعنی معتقدات دین اور مذہبی اعمال میں مداخلت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے "پرسنل لا" یعنی قوانین نکاح و طلاق و وراثت کو جیسے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہیں، بدستور محفوظ رہنے دیا جائے، اگر مسلمانوں کی قدیم رسوم و عادات کو جیسی کہ وہ اسوقت پائی جاتی ہیں، ایک اعلیٰ معنی تک پرانے تبرکات (Old Relics) کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جائے تو بس مسلمانوں کا قومی مسئلہ حل ہو گیا اور اسکے بعد مسلمانوں کو اپنے قومی مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اگرچہ آزادی اور تحفظ کے یہ اعلانات بھی سراسر منافقانہ ہیں، جیسا کہ میں اپنے ایک دوسرے سلسلۂ مضامین میں خود صدر کانگریس کی تحریروں سے اور کانگریس کے شعبہ اسلامیات کے شائع کردہ مضامین سے ثابت کرونگا، تاہم اگر انکو خلوص نیک نیتی پر بھی محمول کیا جائے تب بھی یہ سمجھنا انتہا درجہ کی کم فہمی پر دلالت کرتا ہے کہ ان اعلانات سے ہمارا قومی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ایسی چیزوں پر اطمینان قلب ظاہر کر کے ہمارے سیاسی و مذہبی رہنماؤں نے یہ راز فاش کیا ہے کہ وہ ابھی یہ سمجھے ہی نہیں کہ مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ ہے کیا۔

مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ اگرچہ میں گذشتہ صفحات میں اس مسئلہ کی کافی تشریح کر چکا ہوں، لیکن یہاں ایک مرتبہ پھر کوشش کرونگا کہ اسکو نہایت واضح صورت میں پیش کروں تاکہ یہ زمانہ کا جادو جو جہلا اور علما سب کے دماغوں پر مسلط ہوتا جا رہا ہے، کسی طرح اترے اور مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اپنی توجہات کو اس مسئلہ کے حل کی طرف منعطف کریں۔

اوپر میں بتا چکا ہوں کہ اسلام اُس قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے جو دنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کے لئے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے جو دنیا کو مزرعۃ الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر اور انسان کو زمین میں خلیفۂ الٰہی قرار دیکر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے، تاکہ انسان اس دنیا میں صحیح برتاؤ کرے، اور اسکے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو۔ اس غرض کے لیے

اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطۂ زندگی دیا ہے جو دوسرے ضوابط زندگی، مثلاً کمیونزم، فاشزم، کیپٹلزم، اور بیٹیریلزم وغیرہ سے بالکل مختلف صورت پر انکے نظام اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے، اور انکو علوم و آداب میں، اخلاق و معاملات میں، عادات و اطوار میں، تمدن و معاشرت میں، معیشت و سیاست میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک اور بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریق فکر اور ایک خاص مقصدِ حیات پر رکھی گئی ہے، جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریق فکر و مقصد حیات سے بالکل مختلف ہے جسکی رو سے اشیاء کی قدریں (Values) دوسروں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر متعین ہوتی ہیں، اور جسکے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کیے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقاء اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم ایسا ہو جو انکے دل و دماغ میں اسلام کے طریق فکر و مقصد حیات کو صحیح طور پر پیوست کر دے، اور انکو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں، مسلمان کی حیثیت سے سوچیں، اور اسلام کے بنائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظام تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں، اور ایک ایسا اسلامی ماحول بنجائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کریں، اگرچہ انکے بعض افراد کو علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

انگریزی اقتدار کی غلامی میں ہمکو اصلی نقصان جو پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ اپنی تہذیب کو ایک زندہ تہذیب کی حیثیت سے باقی رکھنے کے یہ دونوں ذرائع ہم سے چھین گئے۔ ایک طرف ہماری قوم پر ایک

ایسا نظام تعلیم مسلط کر دیا گیا ہے جو وسیع پیمانہ پر ہمارے افراد کے طریق فکر کو بدل رہا ہے نظریۂ زندگی اور مقصد حیات کو بدل رہا ہے اور اس معیار کو بدل رہا ہے جس سے وہ اشیاء کی قدر یں متعین کرتے ہیں دوسری طرف ایک غیر قوم کی سیاسی طاقت نے ہم پر ایک ایسا ماحول مسلط کر دیا ہے جو ہمارے عوام اور خواص کی زندگی کو روز بروز اسلامی مناہج سے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے ہمارے قوانین حیات کو بڑی حد تک معطل کر دیا ہے اور ہم اس کی بدولت اس طاقت سے محروم ہو گئے ہیں جس سے ہم اپنی سوسائٹی کو اس مخصوص اسلامی ہیئت پر قائم و برقرار رکھ سکیں۔

پس ہمارا اصل قومی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آج جو انقلاب درپیش ہے اس میں ہم اس نقصان کی تلافی کر سکیں جو انگریزی اقتدار سے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو پہنچا ہے، ہمیں اتنی طاقت حاصل ہو کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو خود اپنی ضروریات کے مطابق بنا سکیں، اور ہمیں حکومت میں اتنا اقتدار حاصل ہو کہ ہم اپنے تمدنی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو خود اپنے اصولوں کے مطابق حل کر سکیں اور اپنے اجتماعی نظام کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر مرتب کر لیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی تشریح میں نے اپنے "نصب العین" والے مضمون میں کی ہے۔ ہم کسی ایسی آزادی وطن کو صحیح معنوں میں پورے وطن کی آزادی نہیں کہہ سکتے جس میں وطن کی ایک مسلمان آبادی کو یہ آزادی حاصل نہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسی حکومت کو وطنی حکومت سمجھ سکتے ہیں جس میں ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو۔ اور نہ ہمیں کسی ایسی جنگ آزادی سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے مشترک وطنی نصب العین (یعنی حریت و استقلال وطن) کے ساتھ ساتھ اپنے اس قومی نصب العین کو بھی حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

"قوم پرستی" کی تحریک جس کے تحت اس وقت آزادی وطن کے نام پر جنگ کی جا رہی ہے۔ درحقیقت ہم کو اپنے اس قومی مقصد کی تحصیل میں مدد نہیں دیتی، بلکہ اس کے برعکس ان نقصانات کو حد کمال پر پہنچانا چاہتی ہے جو ہم کو انگریزی اقتدار سے پہنچے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک ایک غیر قوم کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ہماری قوم میں جہالت، افلاس، اخلاقی انحطاط، اجتماعی بدنظمی، تمدنی بے راہ روی، اور تہذیب اسلامی سے

انحراف کی جتنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں دور کرنے میں ہماری مدد کرنا تو درکنار، وہ تو ان سے الٹا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے، اور ہماری ان اندرونی خرابیوں ہی کو اپنے لیے کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف اس تحریک کے علمبردار اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جمہور مسلمین کے دلوں سے اسلامی قومیت کا تخیل ہی مٹ جائے اور وہ اپنی قومیت کے رشتہ سے کٹ کر معاشی طبقوں میں منقسم ہو جائیں اور آپس میں ٹکڑوں پر لڑنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس تہذیب و تمدن اور تنظیم حیات کے متعلق خود اپنے نظریات موجود ہیں جو اسلام کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں، اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت سے بے خوف ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندستان کی اجتماعی زندگی کو انہی نظریات کے تحت مرتب کریں جس کی لپیٹ میں مسلمان بھی آ جائیں۔ اس طرح یہ تحریک ہمارے قومی مقاصد کے بالکل خلاف واقع ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو نیست و نابود کرنے میں خود حصہ لیں۔ وہ اپنے پروپیگنڈا کی طاقت سے یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ جو لوگ ان کی اس تحریک سے اختلاف کرتے ہیں وہ انگریزی اقتدار کے حامی ہیں، ٹوڈی اور سامراج پرست ہیں لیکن یہ ایک زبردست جعل و فریب ہے، جس کو دن کی روشنی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل سب سے بڑا ٹوڈی اور سامراج پرست تو وہ ہے جو نجات وطن کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے وطن کی آبادی کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتی۔ اپنی اس حماقت سے وہ خود انگریزی اقتدار کے قیام و بقا میں مدد دیتا ہے، اور پھر اس حماقت کا الزام ان لوگوں پر رکھتا ہے جو نجات وطن کے لئے سرفروشی کرنے پر تیار ہیں مگر اپنی قومیت اور اپنی قومی تہذیب کو فنا کرنے پر فطرۃً تیار نہیں ہو سکتے۔

میں ایک مستقل سلسلۂ مضامین اس موضوع پر لکھ رہا ہوں کہ یہ تحریک وطن پرستی کن طریقوں پر چلائی جا رہی ہے اور مسلمانوں کیلیے مسلمان رہتے ہوئے اس کیساتھ اشتراک عمل کرنا کس درجہ مہلک ہے۔

(یہ سلسلہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم کے نام سے شائع ہو چکا ہے)

شبہات اور جوابات

میں نے اپنے گذشتہ مضامین میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن باوجود اسکے ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے متعدد شبہات کا اظہار کیا ہے جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی توضیح مقاصد میں بہت کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند اہم شبہات کو خود معترضین کے اپنے الفاظ میں نقل کر کے رفع کرنیکی کوشش کرونگا۔ امید ہے کہ میرے جوابات سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائینگی۔

اعتراض آپ نے سیاسی کام کرنیکے اکثر اُن طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کیلیے مضر ثابت کرنیکی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آج کل عمل پیرا ہیں۔ لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد اپنے مضمون "راہ عمل" میں خود جو طریق کار مسلمانوں کیلیے تجویز کیا ہے وہ بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے۔ بجائے خود مقاصد بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو انکے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان مقاصد کے حصول کیلیے اندازاً کتنی مدت درکار ہوگی۔ اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ انکے حاصل کرنے میں صدیاں لگ جائینگی تو کیا آپ کہتے ہیں کہ ہندستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں؟

جواب فاضل معترض ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کیلیے جن تدابیر کو میں ضروری اور لازمی قرار دیتا ہوں، وہ "بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو انکے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلّمہ کو محض اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ

تدابیر بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں" اور "انکے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے جنکی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو روبکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اسطرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اسطرح سرسری نظر میں اسے ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف معترض صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو انکے ہم خیال ہیں، اسکے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوتِ فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزء کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجیے کہ آپکو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونیکی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنیکے لیے تیار ہونگے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونیکی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونیکی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں ــــ یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اسکا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے۔ میں اسکو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لیے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اسکے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں۔ (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کرونگا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)۔

۲۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ انکی مسلم ہونیکی حیثیت اور

ہندوستانی ہونیکی حیثیت میں کامل توافق ہو۔ اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقار کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

۳۔ مذکورۂ بالا پالیسی کو مؤثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمراں اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کیساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جسکے قیام پر ہماری مذکورۂ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے۔ اسلئے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصول اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی سپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکینگے؟ پس ہر قسم کے گروہی تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور مؤثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ۔۔۔ کیا آپ اسکو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو یہ فرمائیے کہ آیا یہ حقیقت آپکی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور حاصل نہ ہو تو کچھ پرواہ نہیں، اسکے بغیر ہی آگے بڑھتے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو مؤثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جنکی وجہ سے وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقار کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے۔ اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مہلک ہیں ۔۔۔ آپ فرمائیں کہ اس بیان

کہ کس حد تک آپکو اختلاف ہے؟ کیا آپکا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بدپیدا نہیں ہوسکتے جنکا خطرہ میں نے ظاہر کیا ہے؟ یا آپکی رائے یہ ہے کہ ہمیں حُبِّ وطن یا حُبِّ نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرلینا چاہیئے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جسکی ضرورت میں ثابت کررہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہوسکتی جنہیں اختصار کیساتھ میں نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو سرے سے اسکی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپکو اسکی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا کہ مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان کا جائزہ لیجیے اور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کرکے ہمکو مسلم ہونیکی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانیوالی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائینگے تو آپ کو محسوس ہوجائیگا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جنکی قدر دانی کے لئے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو انکے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے" بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہرحال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل معترض نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کیطرف مسلمانوں کو لیجانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم وعمل، اتحاد واتفاق اور نظم اجتماعی کے آخری وانتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے، اسی بنا پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیگا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جاچکی ہے، لہٰذا اسکو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں لیکن اگر اس کو

ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اسوقت ہمیں درکار ہے اسکے لیے صدِ اول کے مسلمانوں کی سی انتہائی دینداری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اسقدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دیجائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جسکے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کیلیے اجتماعی جد و جہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنیوالے رہبروں کو پہچاننے اور انکا اتباع کرنے سے انکار کر دے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اسکے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اسکے بغیر ہندوستان میں انکا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر انکے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبہ کیساتھ اس کام کیلیے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایک ایسی رائے عام تیار کیجا سکتی ہے لیکن یہ سب کچھ اسوقت ممکن ہے جبکہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر انکی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جسکے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجۂ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کیلیے کوئی اجتماعی جد و جہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

اعتراض | آزادی کی جنگ کا شروع کرنا یا نہ کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ رکی رہے۔ سیاسی جنگ یا آزادی کی جنگ تو عرصہ ہوا کہ شروع ہو چکی اور برادرانِ وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے اور نئے معرکے سر کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اے بھائیو ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی ہمیں بھی تیار ہو لینے دو، پھر جنگ شروع کرنا۔ ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے۔ اور اس پر ایک مجھ کسے لیے

بھی کان دھر سکتا ہے۔

جواب | یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اسوقت تک کے لئے ملتوی ہو جائیگی یا ہو جانی چاہیے جبتک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو لیں۔ پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار ہمارے شریک ہونے سے رک جائیگی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچیگا۔ لہذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرلیں جو شریک جنگ ہونے کیلیے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انہیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

ہر شخص جسے خدا نے تھوڑی سی عقل بھی دی ہے خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف اکثریت ہو اور متحد و منظم ہو، اور دوسری طرف اقلیت ہو اور متفرق و پراگندہ ہو، تو ان دونوں کے مقابلہ کا کیا انجام ہوگا؟ ہمارا حال اسوقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے اور دوسرے گروہ کا کچھ اور ۔۔۔ ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انکو قومی مفاد سے کوئی تعلق ہی نہیں، اور تیسرا گروہ "قومی مفاد" کا نام ہی سنکر "فرقہ پرستی" "ٹوڈیت" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کسنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک جماعت کسی مسئلے پر اسلامی حقوق کی حفاظت کیلیے جدوجہد کرتی ہے اور دوسری جماعت غیر مسلموں کی فوج میں شامل ہو کر سب سے اگلی صفوں میں اسکا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کونسل کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کیلیے اٹھتی ہے اور اسکے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پہ اکتفا نہیں کرتی بلکہ اسکے بعض افراد غیر مسلموں سے تقرب حاصل کرنیکے لیے علانیہ نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانیوالی، ہماری ہوا اکھاڑ دینے والی، اور ہندوستان کی سیاسی میزان میں ہمکو سبک کر دینے والی ہو سکتی ہے؟ اس بیماری

کو ساتھ لیے ہوئے آپ جدھر بھی جائینگے آپ کا کوئی وزن نہ ہوگا، اور آپ کسی ایسی چیز کی حفاظت نہ کر سکینگے جو مسلمان ہونیکی حیثیت سے آپ کو عزیز ہو۔

مگر اسکا یہ مفہوم لینا درست نہیں کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کرتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ درحقیقت معاملہ اسکے بالکل برعکس ہے۔ اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کردیں تو اسکے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتھیاروں پر صیقل بھی ہوگا۔ اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائیگی، ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بھی بڑھتا چلا جائیگا۔ بخلاف اسکے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کرلیے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہوچکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہوگا۔

اعتراض | آپنے اپنے مضمون "آئندہ انقلاب اور مسلمان" میں جدید تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونیوالے مسلمانوں پر بہت سخت تنقید کی ہے اور غالباً آپکا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے سیاسی جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنیکی کوشش کریں۔ نہ اسکا موقع ہے کہ پرانے تعلیم یافتہ لوگ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہہ کر خارج کردیں کہ تم اسکے اہل نہیں ہو، اور نہ اسکا موقع ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ پرانے تعلیم یافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ کے خارج کرنیکی کوشش کریں۔ بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق و متحد یکدل اور یک زبان ہوکر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں اور کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ کا مصداق بنکر دنیا پر ثابت کردیں کہ مسلمان بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اور دنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی تدبیر اس نور الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جسکے مسلمان حامل ہیں۔

جواب یہ ارشاد بالکل سچا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے لیکن معترض کو میرے کن الفاظ سے غلط فہمی ہوئی کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ انکے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جاسکتا ہے کہ اسکے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور جسم واحد بنکر اسکے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لئے ہمکو نصب العین اور طریق کار۔ دونوں کی توضیح کرنی پڑیگی اور جسطرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسیطرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کیساتھ مغالطت نہ برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر جماعت کا ساتھ دینے سے انکار کریں، عام اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ ـــــ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راہوں کی طرف جانیوالے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جاسکتا۔

اعتراض آپنے بلاضرورت جو نئی بحثیں چھیڑی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپکے نزدیک گذشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے اور مختصر یہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ہم میں کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت آپ ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبوں تر ہے، اور ہماری اخلاقی خرابیاں اور کمزوریاں پہلے سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہے تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں رہتے ہوئے ایک ہزار برس ہوگئے، مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ انکی موجودہ اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ ہزار برس پہلے کے بہت بہتر ہے۔

جواب مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدت ملی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم انکو متفرق کرنیوالا تھا نہ کہ مجتمع، انکے اندر ایسی زندگی نہ تھی جس

جو گھن کی طرح انکی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے تاگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن بحیثیت مجموعی انکو نقصان کی بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، انکو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جسکی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے انکے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدہ اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر قائم نہیں ہے، بلکہ نسل اور مرز بوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے انکے قدیم عقائد اور طرز معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے انکی "ہندویت" بہر حال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ انکے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات انکے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں کیونکہ یہی چیز انکے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے انمیں قومیت کا نشو و نما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک خاص اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا، جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جسکا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کیساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اسکی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانیکی موجب ہو گئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اسکو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا،

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اسکی قومیت اور اسکے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، انکو میں تفصیل کیساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مغربی استیلا سے مسلمانوں پر جو اثرات مترتب ہوئے وہ ان اثرات کے بالکل برعکس ہیں جو ہندوؤں پر مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا۔ اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب، تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور انکی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کیلیے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسباب زوال کے ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔

اعتراض: نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی بحث دراصل دور از کار ہے۔ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، وہ سب مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہمارے سیاسی مستقبل کا دارومدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اس بے زبان طبقے پر ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی۔ یہ لوگ مسلمانوں کی آبادی کا ۹۰ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لیے ہم سب کا خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے، یہ فرض ہے کہ اس طبقہ کی اصلاح کریں، اسمیں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں، اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کیلیے استعمال کر سکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیجیے کہ ہم نے سیاسی جنگ جیت لی۔

جواب درحقیقت یہی کام تو ہمارے پیش نظر ہے ہم کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہمارے عوام جنکو اسلام کی تعلیمات سے کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے، جو افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، جنکو اسلامی تہذیب و تمدن کی گرفت میں رکھنے کے لئے کوئی نظام موجود نہیں ہے، جن میں جاہلیت کی رسوم پھیلی ہوئی ہیں، اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے دور رہنے کی بدولت ہندستان کی آبادی کے سواد اعظم سے ہم رنگ ہو گئے ہیں، کہیں اشتراکیت اور نزاع طبقات کی اس تبلیغ کا شکار نہ ہو جائیں جو اسوقت "قوم پرست" جماعت کیطرف سے کیجا رہی ہے، ہمیں اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے ان پست طبقات کو یہ تحریک اسلام کا علم اور شعور رکھنے والے طبقات سے جدا کر دیگی، معاشی کشمکش برپا کر کے انکے درمیان عداوت ڈال دیگی، اور جب یہ طبقے اپنی قوم کے اہل دماغ کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے تو انکی جہالت اور انکے افلاس سے فائدہ اٹھا کر انہیں اقتصادی مساوات کا سبز باغ دکھایا جائیگا، اور اس بہانے سے انکو غیر مسلم عوام میں جذب کر لیا جائیگا۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب تک "قوم پرست" تحریک کے مبلغین اور مسلم عوام کے درمیان جو دیوار حائل تھی، جسکی وجہ سے مسلم عوام انکی تبلیغ کو سننے تک کے روادار نہ تھے اسے ہمارے علمائے کرام اپنی ناعاقبت اندیشی سے منہدم کر رہے ہیں۔ انکے اس فعل کا نتیجہ یہ ہوتا نظر آتا ہے کہ مسلم عوام آہستہ آہستہ ان لوگوں کی باتیں کان دھر کر سننے لگیں گے، اور چونکہ یہ لوگ علانیہ تبدیل مذہب کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ ان اشتراکی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں جو مفلس طبقوں کے دل و دماغ پر بڑی آسانی کیساتھ چھا جاتے ہیں، اس لئے ہمارے عوام رفتہ رفتہ انکے جال میں پھنستے چلے جائینگے اور آخر کار یہ چیز امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دینے، اور جمہور مسلمین کو غیر مسلم سواد اعظم میں مدغم کر دینے کی موجب ہوگی۔ علمائے کرام آج جس چیز کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہے ہیں کل وہ چیز حقیقت بنکر انکے سامنے آئیگی اور ایسی حالت میں آئیگی کہ اسکا علاج انکی قدرت سے باہر ہوگا۔ اس وقت ان حضرات کی آنکھیں کھلیں گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ جو تیر انہوں نے اندھیرے میں چلایا تھا وہ انگریزی سامراج کے بجائے محمد رسول اللہ کی امت کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔

ان خطرات کا سدباب اگر کسی صورت سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک

فعال جماعت ایسی اٹھ کھڑی ہو جو جمہور قوم میں جا کر ایک طرف تو انکے اندر اسلام کی جوہری تعلیم پھیلائے، رسوم جاہلیت کو مٹائے، انکو اسلامی تہذیب و تمدن کے اصولوں سے باخبر کرے، اور دوسری طرف انکی روٹی کے مسئلے کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اشتراکی تحریک کی جو مخالفت کرتے ہیں اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ظالمانہ سرمایہ داری و ناجائز اغراض رکھنے والے طبقوں کے حامی ہیں بلکہ دراصل اسلام کے متبع ہونیکی حیثیت سے ظالمانہ سرمایہ داری کو مٹانے اور مفلس طبقوں کی مصیبتوں کو حل کرنیکے لیے ہم خود اپنے اصول رکھتے ہیں اور وہ اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم اپنی قوم کے معاشی مسائل کو خود اپنے ہی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت کے علمبردار ہمارے جمہور پر قابض ہو کر اپنے طریقوں سے امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دیں۔ ہمارے سامنے اسوقت صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے اسلئے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لیے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہمکو کرنی چاہیے۔ جماعتوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے، وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے بلکہ تمام ازمنہ اور امکنہ کیلئے تھے۔ انکو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قسم کی تنظیم کرنا چاہیں گے آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے اسوقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درکنار، غیر ممکن الوقوع ہے، یا اگر ممکن بھی ہے تو اسکے لیے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے البتہ اسکے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لا سکتی ہے جو سیرت محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفان میں بھی راہ راست پر جمے رہ سکیں، انکے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کیلیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں، پروگرام

تو دنیا میں موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور اپنی خواہش نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جنکے دل نام و نمود کی بھوک، ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنیکا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو، اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ پر نظم کیساتھ کام کر سکیں۔

اعتراض | آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کیلئے آئینی ضمانتوں کو بیفائدہ قرار دیتے ہیں اس بنا پر کہ جب تک ان ضمانتوں کی پشت پر کوئی (Sanction) نہ ہو اکثریت انکی پابندی کیلئے مجبور نہیں ہو سکتی۔ انکے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" بنانے کی کوشش کریں۔ مگر بعینہ وہی اعتراض آپکی اس تجویز پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس وہ کونسی طاقت ہوگی جو اس "سلطنت در سلطنت" کے احکام کو اکثریت کی مرضی کے خلاف نافذ کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ اکثریت یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی یک قلم موقوف ہو جائے۔ مسلمانوں کی یہ "سلطنت در سلطنت" اسکو کیسے روک سکے گی؟ فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے۔ آپ اسکو رجم کی سزا کیسے دے سکینگے؟ فرض کیجیے کہ آپ حد زنا جاری کرنا چاہتے ہیں، کیونکر ممکن ہے کہ آپ مرتکبین زنا کیا بلکہ غیر مسلم زانیوں یا زانیات پر بھی حد جاری کر سکیں؟

جواب | "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے جسکا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اس نظام کی مضبوطی اور اسکے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گنی اکثریت پر حکمراں ہیں۔ ایک جمہوری نظام حکومت میں بھی "اقتدار اکثریت" (Majority Rule) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے۔ پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت

درسلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں کن حدود تک وسیع ہوگی، اس لیے طے نہیں ہو سکتا جبکہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے ۔ پہلے ہمکو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے ۔ پھر ہم جتنی طاقت فراہم کرلیں گے اسی کی نسبت سے "سلطنت درسلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہونگے

اعتراض | آپ کہتے ہیں کہ اگر ہم دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام ہی قائم کرنیکی کوشش کریں لیکن میں کہتا ہوں کہ جو نظام حکومت اسوقت قائم ہے، یا جو آئندہ آئینی ضمانتوں کے تحت قائم ہوگا وہ بھی تو شبہ دارالاسلام ہوگا کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دارالاسلام نہیں ہے اور دارالحرب بھی نہیں ہے، لہذا ان دونوں کے بین بین جو صورت بھی ہو اس پر شبہ دارالاسلام ہی کا اطلاق ہونا چاہیے ۔

جواب | "شبہ دارالاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے، جو خالص "دارالکفر" کی بہ نسبت خالص "دارالاسلام" سے زیادہ اقرب ہو ۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے ۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں ۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے جسکے حدود کو کم یا زیادہ کرنا انکے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہے ۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے انکے نفاذ کو روک دیتے ہیں اور جو مذہبی احکام انکی مصلحتوں کے خلاف ہیں انکو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے ۔ اسکے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو انکی نگاہ میں بے ضرر ہیں انکے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں لیکن اس محدود آزادی کے دائرے میں بھی ہم انکے اقتدار کے بلا واسطہ اثر سے محفوظ نہیں ہیں ۔ انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اسکے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ اُن مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگا ہے جنکی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں ۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اسکی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصول معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہمکو ان اصولوں

کی پابندی سے روکتا ہو، اسی طرح انکا نظام عدل و قانون اور انکا آئین حکومت ایسا ہو جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن ہر چیز پر بلاواسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اسکے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کیلیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لاسکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدار مطلق فی نفسہ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہو، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنیکے لیے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اسکے قدموں میں لاکر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لیے اسے شبہ دارالکفر کہنا چاہیے نہ کہ شبہ دارالاسلام۔

میں جس چیز کیطرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رکھنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں، وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کیلیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اسکی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے، اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی کیساتھ آنیوالی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کرسکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائیگی اور پوری طرح مستحکم ہو جائیگی اس وقت ہمارے لیے اپنا اختیار استعمال کرنیکا شاید کوئی موقع باقی نہ رہیگا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دارالکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اسکے قائم ہونے میں مدد دی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اسکی گرفت میں پکڑے گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی بندشوں میں سے چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر چلنے دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اسکی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کرسکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دارالکفر کی جگہ ایک دوسرا دارالکفر لے لیگا، اور اسکے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اسکی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اسوقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جسکو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی

ضرورت نہیں محض عقل عام (Common-sense) رکھنے والا ایک عامی بھی اسکو سمجھ سکتا ہے اگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کیلئے بھی دلائل کی ضرورت پیش آرہی ہے اور دلائل کے زور سے بھی اسکو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اسلئے کہ انکی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کا ضمیر تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ شہدا لکفر ہو یا خالص دارالکفر ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہیے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

اعتراض | آئینی ضمانتوں پر تو بہرحال برطانوی حکومت اور ہندوستان کی اکثریت کو راضی کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک قابل عمل چیز نظر آتی ہے لیکن "سلطنت در سلطنت" کا تو تخیل ہی ایسا ہے جس پر نہ برطانوی حکومت راضی ہو سکتی ہے اور نہ ہندوستان کی اکثریت۔ یہ نام درمیان میں آجانیکے بعد تو مصالحت کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔

جواب | اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اسکو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ معترض صاحب اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرینگے۔ آئینی ضمانتیں، اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو، تو انکا قائم رہنا یا نہ رہنا بہرحال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اسوقت انگریزی اقتدار کی ہے، اور اسکے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں۔

اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا دارومدار ہو وہ اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے، خواہ کوئی

اُس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

اعتراض | یہ سلطنت در سلطنت کا تخیل ہندوستان کی سیاسی ترقی کیلیے بھی تو مفید نہیں ہے اگر اسی طرح ہندوستان کی ہر قوم سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانیکے لیے اٹھ کھڑی ہو تو فی الواقع ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم ہی نہیں رہ سکتی، بلکہ اسکی جگہ فرقہ دارانہ انارکی لے لیگی۔

جواب | میں اپنے نصب العین والے مضمون میں اُن کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کیلیے ضروری ہیں "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جو انہی حقوق اور اختیارات کو استعمال کرے اور جسمیں اتنی طاقت ہو کہ اگر کوئی ان حقوق اور اختیارات میں کمی کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ آپ اس مضمون کو غور سے دیکھیے اس میں جن حقوق اور اختیارات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کونسی چیز ایسی ہے جو مشترک ہندستانی مفاد کیلیے ہمکو دوسری ہمسایہ اقوام کیساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشو و ارتقاء میں مانع ہو؟ اگر ہندستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کیلیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) حاصل کرلیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور ان سب کو ایسی خود اختیاری حاصل ہونیکے بعد بھی ہندستان کا مشترک نظام حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے صرف نظری سیاسیات (Theoretical politics) کا مطالعہ کیا ہے وہ "سلطنت در سلطنت" کا نام سنکر کان کھڑے کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ایک نا قابل عمل چیز ہے لیکن عملی سیاسیات میں وسیع یا محدود پیمانے پر سلطنت در سلطنت کا وجود قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں پایا جاتا ہے اور سیاسی انصاف کیلیے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ جہاں سلطنت کا غلبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کے تمام دوسرے طبقے سلطنت در سلطنت سے محروم ہو گئے ہیں وہاں ظلم اور بے انصافی کا دور دورہ ہے۔ علاوہ بریں واقعات اسکا ثبوت دیتے ہیں کہ سلطنت در سلطنت نا قابل عمل چیز نہیں ہے ہندستان کے آئندہ نظام حکومت کی ترقی میں اگر خلل ہو سکتی ہے

تو صرف اُس صورت میں جبکہ اس ملک کی مختلف قوموں کے اندرونی نظامات ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ طرزِ عمل
اختیار کریں، اور اپنی مرضی کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں لیکن ہمیں اس نوعیت کی سلطنت در سلطنت
مطلوب نہیں ہے جو انارکی اور خانہ جنگی برپا کرنے والی ہو۔ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ہم جس چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ
اولاً ہمیں خود اپنے اصولوں کے مطابق اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کرنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہو۔ ثانیاً ہندوستان
کی سیاسی زندگی میں ہم کو اتنا اثر حاصل ہو کہ اس ملک کا سیاسی و تمدنی ارتقاء ہمارے اصول تہذیب اور مصالح قومی کے
خلاف راستہ اختیار نہ کرنے پائے۔ اور ثالثاً اگر یہ ارتقاء ایسا کوئی راستہ اختیار کر رہا ہو تو ہم اتنے طاقتور ہوں کہ اپنی اجتماعی
طاقت سے اس کو روک سکیں ۔۔۔ یہی تین عناصر ملکر اس مفہوم کی تکمیل کرتے ہیں جسے میں "سلطنت در سلطنت" سے تعبیر کر رہا
ہوں، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی یہ حاصل ہو تو اس سے کوئی بدنظمی واقع نہیں
ہو سکتی۔ اسلامی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ محض عقل کی رو سے انصاف کا تقاضا معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف یہ ہوگا کہ جب
ہندوستان تمام قوموں کا مشترک وطن ہے اور اسکی خوشحالی و ترقی سب کے عمل اور سب کی محنتوں اور قابلیتوں کا نتیجہ ہے تو یہاں
کسی قوم کو بھی اتنا با اقتدار نہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کر دے، اور نہ کسی قوم کو اتنا بے بس ہونا چاہئے کہ وہ اپنی
اُن چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے جنہیں وہ جان و مال سے زیادہ عزیز رکھتی ہو۔

اعتراض: آپ کے اندازِ تحریر سے خوف و ہراس کی بو آتی ہے۔ آپ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کھا جائیں گے۔
کیا یہ خوف محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کثیر التعداد ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ میں قلیل التعداد ہیں؟ کیا قرآن آپ کو یہی سکھاتا
ہے کہ قوت اور غلبہ کا مدار کثرت اور قلت پر ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی بزدلی ہو سکتی ہے کہ مسلمان ان مشرکین
سے ڈر جائیں جو ۳۳ کروڑ خداؤں کو پوجتے ہیں؟ مسلمان ایک موحد قوم ہے اس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے
اسکے اندر ایمان کی حرارت ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ کفار و مشرکین اس پر غالب ہو جائیں؟ مسلمانوں کو اپنی
قوت پر اعتماد ہونا چاہیے اور اسی اعتماد پر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہیے۔ اگر ان میں عزم اور ہمت

ہو تو کسی قوت سے بھی انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان پر دوسرا کا رنگ کیا چڑھے گا۔ انکے پاس تو صبغۃ اللہ ہے جو تمام رنگوں پہ غالب آنے والا ہے

جواب: یہ اعتراض چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، اور زیادہ تر ان لوگوں کیطرف سے پیش کیا گیا ہے جنہیں سمجھنے سے پہلے بول دینے کی عادت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں خوف ہندوؤں کی طاقت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوریوں، اور ان کمزوریوں سے ہے جنہیں قرآن نے قوموں کے اسباب زوال میں شمار کیا ہے۔ قرآن کسی جگہ بھی یہ نہیں کہتا کہ مسلمان صرف اس بنا پر دنیا میں غالب ہونگے کہ انکے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، اور کفار صرف اس بنا پر ان سے مغلوب ہو جائینگے کہ وہ شیام سندر یا رابرٹسن جیسے ناموں سے موسوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن اس تیرہ سو برس کی تاریخ میں نعوذ باللہ ہزاروں مرتبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ گذشتہ دو سو برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ اسکے جھوٹ کا زندہ ثبوت ہوتا (معاذ اللہ)۔ یہ قرآن رکھنے والے موحد مسلمان جنکا آپ ذکر فرماتے ہیں چین سے لیکر مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ مگر کیا یہ چین کے بت پرستوں، روس کے ملحدوں، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کے تثلیث پرستوں سے مغلوب نہیں ہیں؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد مسلمان صقلیہ اور اندلس میں بھی تھے، مگر کیا یہ وہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے گئے؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد فتنۂ تاتار کے زمانے میں بھی تھے، مگر کس چیز نے انکی تہذیب اور انکی عظیم الشان سیاسی طاقت کو مشرکین تاتار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا؟ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے، خوابوں کی دنیا نہیں ہے۔ آپ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی منتر آپکو سکھا دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی طلسم کے پتلے غیب سے پیدا ہونگے اور کفار کو تہ تیغ کر دینگے۔ آپ قرآن اپنے گھر میں رکھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی تعویذ آپکے پاس آیا ہوا ہے جسکا بس گھر میں موجود ہونا ہی اسے تمام آفات ارضی و سماوی سے محفوظ کر دیگا اور خدا اپنے قانون فطرت کو آپکے لیے بدل ڈالیگا۔ وہ تمام اخلاقی عیوب اور تمام قومی امراض اپنے اندر پاتے ہیں جو کفار، مشرکین اور منافقین کے خصائص میں سے ہیں، اور پھر یہ پندار بھی اپنے دماغ میں رکھتے ہیں کہ ہم ہی مومن ہیں جن سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا وعدہ کیا گیا تھا، اور جب کوئی یاد دلاتے

کہ ان کمزوریوں کے ساتھ آپ کسی انقلاب کے طوفان میں زندہ نہیں رہ سکتے، تو اسکو بزدلی کا طعنہ دیجیے۔ یہ اگر بہادری اور عقلمندی ہے تو ایسی بہادری اور عقلمندی آپ ہی کو مبارک رہے۔ میں تو اسے خام خیالی اور طفل تسلی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زندگی کے نہیں تباہی کے لچھن ہیں۔ میں اس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جوشیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

بے شک کثرت و قلت پر غلبہ و قوت کا مدار نہیں ہے کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ایک حقیقت ہے۔ مگر کچھ سوچا بھی ہے کہ وہ کونسی اقلیت ہے جو اکثریت پر غالب آتی ہے؟ وہ اقلیت جس میں نظم ہو، جس میں اطاعتِ امر ہو، جس میں وحدت ہو، جس میں ایک نصب العین پر کامل اتفاق ہو، جس میں اپنے نصب العین کی خاطر اجتماعی جد و جہد کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ ہو، جسکے افراد میں سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی ہو، جسکے افراد اپنی تہذیب کے اصولوں پر سختی کیساتھ عامل ہوں، اور جس میں منافقین کا وجود عنقا ہو۔ ایسی اقلیت اگر آپ میں ہو تو ۲۲ کروڑ ہندو کیا چیز ہیں، تمام دنیا کے کفار ملکر بھی آپکو مٹا نہیں سکتے۔ لیکن فی الواقع کیا آپ ایسی ہی اقلیت ہیں؟ اگر ایسی اقلیت آپ تھے تو تین لاکھ انگریز ہزاروں میل کے فاصلے سے آکر آپکے آٹھ کروڑ افراد کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہوگئے؟ بچوں کیطرح خواب نہ دیکھیے، ہوش میں آکر اس دماغ سے بھی کچھ کام لیجیے جو خدا نے آپ کو سوچنے اور سمجھنے کیلیے دیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھکر آپنے خدا پر کوئی احسان کیا ہے جس کے معاوضہ میں وہ آپکے لیے تمام قوانینِ طبیعی کو الٹ دیگا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت متحد ہو رہی ہے، اس میں نظم پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک مرکز کی اطاعت پر مجتمع ہو رہی ہے، وہ ایک نصب العین کی خدمت کیلیے قربانیوں پر آمادہ ہے، اس نے اپنے منافقین کا بڑی حد تک استیصال کر دیا ہے، اور وہ اپنے افراد میں سیرت کی مضبوطی پیدا کر رہی ہے۔ اسکے مقابلہ میں آپ خود اپنا حال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ میں کوئی نظم نہیں، کوئی مرکزیت نہیں، کوئی متفق علیہ

نفس العین نہیں، کوئی صاحبِ امر شخص یا جماعت نہیں جسکی آپ اطاعت کریں۔ آپکی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آراء ہو رہی ہیں کبھی بجنور میں اور کبھی مراد آباد میں خانہ جنگی کیلیے آپکے اکھاڑے برپا ہوتے ہیں خم ٹھونک کر بھائی کو بھائی چیلنج دیتا ہے اور جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار لیتا ہے تو اغیار کے سامنے اپنی برادر کُشی پہ سینہ تان تان کر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ آپکے افراد اور نامور افراد کیرکٹر کی ایسی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں جو ساری قوم کی ہوا اکھاڑ دیتی ہے۔ آج اس گروہ میں ہیں تو کل دوسرے گروہ میں۔ آج یہ طاقت غالب ہے تو اسکے ساتھ ہیں، کل دوسری طاقت ابھرتی نظر آئی تو دفعتاً انہوں نے بھی اپنی وفاداریوں کا رخ بدل دیا۔ افراد تو درکنار آپکی جمعیتوں تک کا یہ حال ہے کہ ان میں کسی قسم کی استقامت رائے نہیں پائی جاتی۔ غیر مسلم خواہ کوئی طرزِ عمل اختیار کریں، دو چار اسلامی جمعیتیں انکی مخالف ہونگی تو دو چار انکا ساتھ دینے کیلیے بھی کھڑی ہو جائینگی، اور یہ حقیقت دنیا پر آشکارا کر دینگی کہ مسلمانوں میں بہت آسانی سے تفرقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وہ قومی سیرت ہے جسکو لیکر آپ توقع رکھتے ہیں کہ آپکے لیے کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً کا معجزہ صادر ہوگا؟

قرآن اور سیرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے۔ آپکو معلوم ہوگا کہ خدا کے قانون میں جانبداری کہیں نہیں ہے۔ جو اس قانون کے خلاف چلیگا، خواہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو، پیس ڈالا جائیگا، اور جو اسکی شرائط پوری کریگا، خواہ وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو، غالب اور فتح یاب ہوگا۔ صحابۂ کرام کی جماعت سے بڑھ کر ایمان کی حرارت اور سیرتِ اسلامی کا استحکام رکھنے والی جماعت تو کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسی کامل الایمان جماعت بھی مشرکین سے متعدد مرتبہ شکست کھا گئی، اور وہ بھی کس حالت میں؟ جبکہ خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم انکے درمیان موجود تھے اور بنفس نفیس انکی قیادت فرما رہے تھے۔ جنگ احد میں صرف اتنا ہی قصور تو ہوا تھا کہ مومنین کے دلوں میں مال کی محبت آ گئی اور انہوں نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ پتھر کو پوجنے والے خدائے واحد کی عبادت کرنیوالوں پر چیرہ دست ہو گئے اور

خود رسولِ خدا انکے ہاتھوں زخمی ہوئے حَتّٰی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ...... اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ (آل عمران، رکوع ۱۶) جنگِ حنین میں صرف اتنی ہی کوتاہی تو ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا قانونِ فطرت نے اسکی سزا یہ دی کہ مشرکین کے مقابلے میں انکے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ (التوبہ، رکوع ۴) جو خدا ایسے بے لاگ قانون کیسا تھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اگر اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اہل ایمان کی صفات سے عاری ہونیکے بعد بھی وہ آپ کی حمایت کریگا اور ان مشرکین کے مقابلے میں آپکو ثابت قدمی بخشے گا جو اسکے قانونِ طبیعی کی شرائط آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر پوری کر رہے ہیں، تو میں آپ کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ آپ عقل سلیم اور علم قرآن دونوں سے محروم ہیں۔

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیدا ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انھیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انھی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار بند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بےجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور